میخانے

ماہر القادری

مشہور پبلشنگ ہاؤس دہلی

باراول۔ دو ہزار   مطبوعہ جمال پریس دہلی   قیمت فی جلد عہ

پرواز

اس عالمِ کون وفساد اور دُنیائے حادثات میں آدمی کو ایک لمحہ کے لئے بھی چین اور آرام نہیں ملتا۔ اضطراب اور مسلسل اضطراب، کش مکش اور پیہم کش مکش —— بس یہی خوابِ زندگی کی تعبیر اور افسانۂ حیات کا عنوان ہے۔ خس پوش جھونپڑیاں اور فلک بوس قصر و ایوان کش مکش و اضطراب کے ایک ہی طول البلد (Longitude) پر واقع ہیں۔ مطلق سکون اور حقیقی راحت کانٹوں کے بستر پر ہی نہیں پھولوں کی سیج پر بھی نہیں ملتی۔ برفاب اور خس خانے بھی بے چینی کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکتے، خارِ غم ہر دل میں کھٹکتا ہے —— اُس دل میں بھی جس کے ایک اشارے پر دُنیا کی تمام رنگینیاں سمٹ کر یکجا ہو سکتی ہیں۔

ہفت آسیا بگردش ؛ ما در میانِ او
غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ می رود

مضطرب دل کو خوشی کا بُھلاوا دینے کے لئے ہر آدمی نے کسی نہ کسی

چیز کو اپنی دل چسپی اور شوق کا مرکز بنا لیا ہے، دُنیا میں کوئی نہ کوئی چیز اور کام آدمی کا منظورِ نظر اور پسندیدہ (Pleasant) ضرور ہے۔ اس طرح دردِ اضطراب کا مداوا تو نہیں ہوتا مگر ہاں بے چینیوں میں لذّت پیدا ہو جاتی ہے —— یہی وہ لذّتِ غم لُطفِ اضطراب، شوقِ جستجو اور احساسِ خلش ہے جسے ہم مسرّت کے نام سے یاد کرتے ہیں ——!

زمانے میں کہیں صبر و سکوں بھی ہاتھ آتا ہے
بس اپنا رُخ بدل دیتا ہے دردِ ناشکیبائی

انجم کو پرندوں سے بے حد دل چسپی تھی۔ اُس کا تخیّل فرصت ہی نہیں مصروفیت کے وقت بھی پرندوں کی فضا میں پرواز کرتا تھا۔ عام لوگوں کو چڑیوں میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی بس زیادہ سے زیادہ یہ کہ بعض پرند خوش منظر اور خوش الحان ہوتے ہیں۔ مگر انجم پرندوں کے صرف رنگ و آواز کا فریب خوردہ نہ تھا اُس نے پرندوں کے عادات و اطوار اور اُن کی زندگیوں کا کھوج لگایا تھا۔ وہ پرندوں کو اُسی انہماک اور توجّہ کے ساتھ دیکھتا جس طرح کسی بنک کا کلرک اور محاسب روپیوں کے اعداد اور میزان پر توجّہ کرتا ہے۔ کوئی چڑیا نظر آئی اور انجم کی نگاہیں اُس پر جم کر رہ گئیں، چونچ کی نوک سے لے کر پنجوں کے آخری حصّہ تک ایک ایک چیز پر انجم کی نگاہ پڑ رہی ہے۔ چڑیا نے زمین سے دانہ اُٹھاتے ہوئے کتنی بار اِدھر اُدھر دیکھا، دانہ چونچ میں لینے کے بعد وہ پنجوں کے بل تھوڑی دُور چلی یا فوراً اُڑ گئی، چڑیا نے پروں کو چونچ سے کھجاتے ہوئے

کس انداز سے جھرجھری لی اور نر و مادہ میں کون سب سے پہلے اُڑا۔؟
اِن تمام مراحل، مدارج اور طور طریق کو انجم دیکھتا اور انتہائی غور و توجہ کے ساتھ دیکھتا۔

کبوتر کی سادہ مزاجی، کوّے کی عیاری، سارس اور مور کی سست پردازی اور عقاب کی تیز نگاہی کے اسباب و وجوہ سے انجم واقف تھا۔ ایک مرتبہ انجم ایک پہاڑی پرند کے پیچھے کھیتوں میں نکل گیا، چڑیا خوبصورت سے زیادہ شوخ تھی اور اُس کی بولی تمام پرندوں سے مختلف تھی۔ خریف کی فصل پک کر تیار ہو چکی تھی۔ کسان خس پوش مچانوں پر بیٹھ کر اپنے کھیتوں کی رکھوالی کر رہے تھے، انجم کا مرکزِ نگاہ پرند مکا کے کھیت میں اڑ کر پہنچ گیا۔ انجم نے اُس کا پیچھا کیا، وہ کھیت میں دبے پاؤں جُھک جُھک کر چلنے لگا، کھیت والے نے مچان سے دیکھا کہ کوئی آدمی کھیت میں چھپ چھپ کر چل رہا ہے۔ کسان تیزی کے ساتھ مچان سے اُترا کہ آج چور پکڑ لیا۔ اُس کو یقین تھا کہ کوئی شخص مکا کے بھٹے چرانے کے لئے آیا ہے۔ انجم پرند کی تاک میں بیٹھا تھا اور کسان اُس کے تعاقب میں آہستہ آہستہ پہنچا۔ چور اور ڈاکو پر ایکا ایکی ہاتھ ڈالنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے، اچھے اچھے جیوٹ اور بہادر بدحواس ہو جاتے ہیں۔ کسان نے پاس پہنچکر انجم کو للکارا کہ کھڑے رہنا ایک قدم بھی آگے نہ اُٹھانا، انجم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر کا دیہاتی ہاتھ میں لاٹھی اور کاندھے پر انگوچھا ڈالے لمبی لمبی ڈگیں بھرتا ہوا آرہا ہے

دیہاتی کی آواز اور پودوں کی کھڑکھڑاہٹ سنکر انجم کا وہ پرندہ اُڑ گیا۔ جس کے تعاقب میں وہ ادھر آنکلا تھا۔

"تمہارے پیروں کی کھڑکھڑاہٹ نے میری چڑیا کو اُڑا دیا، کتنے زمانہ کے بعد ایسی عجیب چڑیا دیکھنے میں آئی تھی تمہارے آجانے سے میری اتنی دیر کی محنت خاک میں مل گئی!"

انجم نے جھنجلا کر کہا۔

"کیسی چڑیا؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ——— کسان نے حیرت انگیز لہجہ میں جواب دیا اور وہ اس لئے کہ اُسے یقین تھا کہ یہ کوئی چور صاحب دن دہاڑے مکّا کے بھُٹّے توڑنے کے لئے کھیت میں آئے ہیں اور اُن کے پاس چوری کے بہت سے بھُٹّے ہوں گے، بس میں اُن کو پکڑ ہی لوں گا۔ مگر یہاں صورت حال ہی کچھ اور نکلی، کسان نے جس شخص کو چور سمجھا تھا اُس کے ہاتھ میں چڑیا کے دو تین پروں کے سوا کوئی اور چیز نہ تھی۔ کھیت کے کسی پودے کو انجم نے چھوا تک نہ تھا،

"ارے صاحب! اس کھیت میں ایک چڑیا بیٹھی تھی، لاکھوں روپیوں کا تھا وہ پرندا دوپہر سے اُس کے پیچھے میں پھر رہا ہوں، تم نے یہاں آکر میری کوششوں پر پانی پھیر دیا" ——— انجم جواب دیتے ہوئے پروں کو دیکھنے لگا۔

ہاں! تو ہجور (حضور) شکار کھیلنے آئے تھے۔ پر آپ کے پاس بندوق وندوق تو دکھائی نہیں دیتی۔ آپ جال سے شکار کھیلتے ہوں گے۔

کس پودے پر لگائے ہیں آپ نے پھندے؟" ——— کسان نے دریافت کیا۔

"بھیا! ہم پرندوں کے گوشت پوست کے شکاری نہیں ہیں، اس لئے نہ ہم بندوق رکھتے ہیں اور نہ پھندے! ہمارا شکار دوسروں کے شکار سے ملتا جلتا نہیں ہوتا، ہم چڑی مار نہیں ہیں" ———

انجم جواب دیتے ہوئے وہاں سے چل دیا اور کسان بہت دور تک اُسے دیکھتا رہا، انجم کی باتوں کو وہ بالکل نہ سمجھ سکا، کسان کے ذہن میں پرندوں کے تعاقب کے معنی شکار کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ کہ جال لگایا، بندوق کا فیر کیا اور گرفتار یا زخمی پرند کو چاقو سے حلال کر ڈالا۔ اُس بیچارے کو کیا خبر کہ اس دُنیا میں کچھ خدا کے بندے ایسے بھی ہیں جو پرندوں کی زندگیوں کے مطالعے میں اپنی ساری عمر صرف کر دیتے ہیں ———

انجم پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ اُس نے غریب کسان کو تفصیل کے ساتھ جواب دے کر تشفی کیوں نہیں کی، بے خبر کو باخبر بنانا بہت بڑا ثواب ہے، تجربات و مشاہدات سے ذاتی طور پہ فائدہ اُٹھانا خود غرضی ہے۔ ان کو عام ہونا چاہئے۔ مگر سوال یہ ہے کہ انجم کسان کو کس طرح سمجھاتا کہ پرندوں کے عادات و اطوار معلوم کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ جس طرح دوسرے لوگ کتابوں کو پڑھتے ہیں۔ میں پرندوں کو پڑھتا ہوں، کسان اُس کے جواب میں جھٹ بول اُٹھتا کہ

اتنی کچھ دوڑ دھوپ کرنے میں آخر فائدہ کیا ہے؟ اور کسان کی زبان پر
جب "فائدے" کا لفظ آتا ہے تو اُس کے ذہن میں روپیوں کی ڈھیری یا
نوٹوں کی گڈّی اور غلّہ کا انبار ہوتا ہے، اس لئے کہ اُس کے خیال میں،
"فائدہ" بس انہی نعمتوں سے عبارت ہے، انجم نے خاموش رہنا ہی
مُناسب سمجھا۔ ہر بات ہر شخص کو نہیں سمجھائی جاتی، بے خبر کو باخبر بنانا
جتنا بڑا ثواب ہے اُس سے زیادہ گناہ اس بات میں ہے کہ ایک
سکون پذیر دماغ کو خواہ نخواہ اُلجھن میں ڈال دیا جائے ——
انجم کا یہ شوق اس لئے نہیں تھا کہ دُنیا میں اُسے پرندوں کی ریسرچ
(Re-Search) کے سبب شہرت حاصل ہو جائے۔ لوگ اُس کے
نام اور کام کو جانیں۔ یونیورسٹیوں سے اعزازی ڈگریاں ملیں۔ اور
اُس کے نام کے ساتھ "ماہر طیور" (Expert in Birds)
کا دُم چھلّا لگا دیا جائے۔ نام و نمود اور شہرت و اعزاز کے اُن
تصورات کی پرچھائیں بھی اُس کے ذوق و شوق پر نہ پڑی تھی۔ یہ سب
کچھ وہ صرف اپنے ذاتی ذوق کی تسکین کے لئے کرتا تھا، یہ اُس کا
شوق تھا، دل چسپی تھی، پسندیدہ مشغلہ تھا اور سب سے بڑھ کر یہ
کہ دل بہلانے کا ایک سادہ و معصوم ذریعہ ——! دوسرے لوگ
کلب گھروں، تھیٹر ہالوں اور تفریح گاہوں میں جا کر جی بہلاتے ہیں
اور انجم چھتوں کی مُنڈیروں، درختوں کی ڈالیوں اور بجلی کے کھنبوں پر
بیٹھے ہوئے پرندوں اور ہوا میں اُڑتی ہوئی چڑیوں کو دیکھ کر بلکہ

اُن کو پڑھ کر اپنا جی بہلاتا۔ انسانوں سے اُس کو نفرت نہ تھی مگر انسانوں کی زندگیاں پڑھ کر اُسے ہمیشہ دُکھ ہوتا تھا اس لئے انجم نے پرندوں کی زندگیوں کو غور و فکر کا مرکز بنا لیا تھا۔

رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ شوق محبّت اور دلچسپی عشق بن جاتی ہے۔ مجاز ہو یا حقیقت، ہوس ہو یا پاکیزگی، ہر کیفیت، جذبہ اور شوق آغاز میں شدید نہیں ہوتا، یہ تعلق کا تسلسل اور شوق کی فراوانی ہے جو دلچسپی کو انہماک، شغف اور محبّت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ ہر کام کے لئے لگاؤ، تعلّق اور دلچسپی کا مسلسل باقی رہنا ضروری ہے۔ انجم کا پرندوں سے لگاؤ اب استغراق بن چکا تھا۔ جہاں کوئی چڑیا دکھائی دی بس انجم نے اُس پر آنکھیں گاڑ ہی تو دیں۔ نسیمِ صبح کے خوش گوار اور نرم رو جھونکوں کے مقابلہ میں پرندوں کے پروں کی ہوا اُسے زیادہ اچھی لگتی تھی۔ اور کوّے کی کائیں کائیں کو وہ ہارمونیم کے خوش آہنگ نغموں سے زیادہ فطری سمجھتا تھا، بس یوں سمجھئے کہ انجم کی زندگی پرواز بن کر رہ گئی تھی، وہ سوتا تو پرندوں کے خواب دیکھتا یعنی یہ کہ وہ عقاب کے ساتھ فضائے آسمانی میں پرواز کر رہا ہے، قمریاں اور بلبلیں اُس کے ساتھ مل کر گا رہی ہیں۔ اُس کا جسم پرندوں کے خوشنما پروں سے ڈھکا ہوا ہے، مُرغابیوں کے ساتھ وہ تالاب میں تیر رہا ہے، تیتروں اور بٹیروں کے ہمراہ وہ بھی کسی صیّاد کے جال میں پھنس کر رہ گیا ہے طوطے اور مینا میں اُس سے باتیں کر رہے ہیں۔ غرض نیند میں بھی وہ پرندوں کے خیال سے غافل نہ رہتا۔

جس آدمی میں کوئی غیر معمولی بات چاہے وہ بڑے پن کی ہو یا انوکھے پن کی پیدا ہو جاتی ہے تو لوگ اُسے خاص نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ پرندوں کے ساتھ انجم کا یہ والہانہ شغف محلہ کے بسنے والوں کے لئے ایک عجیب اور خاص چیز بن گیا تھا۔ لوگ اُسے طرح طرح کے ناموں سے پکارتے تھے:۔

مولانا طاؤس

عقاب خاں

مرزا کبوتر بیگ

بُلبل نواب

Mr. Bird

شوقِ پختہ کا رطعن و طنز سے دل شکستہ نہیں ہوتا، انجم بھی لوگوں کی باتوں کی مطلق پروا نہ کرتا، وہ جانتا تھا کہ طنز کرنے والے اُس لذت سے بیخبر ہیں جس لذت کے لئے اُس کی نگاہیں وقفِ نظارہ رہتی ہیں، اہل ظرف انجانوں کو سدا معاف کر دیا کرتے ہیں۔ ہاں! اربابِ خیر کے طعنے قلبِ حق شناس پر گراں گذرتے ہیں۔ لوگوں میں انجم کے اس انہماک کے چرچے ہونے لگے، چڑیوں کو دیکھ کر لوگ بے ساختہ کہہ اُٹھتے نہ ہوا اِس وقت انجم جوان چڑیوں کے پروں کو تو کم سے کم گن لیتا۔ پرند اور انجم دو مرادف لفظ بن گئے تھے۔ محلّہ میں کوئی پرند ذبح ہوتا تو از راہِ تمسخر کہا جاتا کہ یہ جناب انجم کے شوق پر چھری چل رہی ہے۔

انجم کے اس شغف میں روز بروز ترقی ہوتی جا رہی تھی اور شوق کی یہ فراوانی اس صورت میں تھی جبکہ طیور کو اس بات کا احساس تک نہ تھا کہ اس دُنیا میں ایک آدمی اُن کا اس قدر شیدائی اور فریفتہ موجود ہے ۔ اگر کہیں پرندوں کی طرف سے بھی انجم کے شوق کی پذیرائی ہوتی تو وہ شدّتِ مسرت سے شاید دیوانہ ہو جاتا ۔ پرندے اُس کے تصوّرات پہ بُری طرح سایہ فگن تھے ، اُس نے ایک دن ریڈیو میں خبر سُنی کہ امریکہ کے کسی کارخانے میں دھماکہ ہوا اور پانسو آدمی اُسی وقت ہلاک ہو گئے ، انجم نے دوستوں سے خبر بیان کرتے ہوئے کہا ، سُنا آپ نے ! اس موذی سائنس کی بدولت کیسی کیسی تباہیاں ہو رہی ہیں ، امریکہ کے ایک کارخانہ میں دھماکے کے سبب پانسو کبوتر مر گئے ۔ دوستوں کے قہقہہ لگانے پر اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ شرما کر بولا میرا مطلب یہ تھا کہ پانسو آدمی ہلاک ہو گئے ، ایک دوست نے اس پر کہا ، ہم تو آپ کے کہتے ہی سمجھ گئے تھے کہ انسانوں کو کبوتر کہا جا رہا ہے ۔ اور آپ کی نگاہ میں تو آدمی اور پرندوں میں مشکل ہی سے کوئی فرق ہو گا بلکہ پرندے ہی کچھ زیادہ وقیع ہوں گے ، یہ زمین پر چلنے والے سُست انسان بھلا آسمان کی فضا میں اُڑنے والے تیز پرندوں کی ہمسری کس طرح کر سکتے ہیں ؟ " فوق " بہر حال " تحت " سے زیادہ معزّز ہوتا ہے ۔

انجم ایک دن گھر سے بازار جانے کے لئے نکلا ، چند قدم چلنے

کے بن بجلی کے کھمبے پر ایک چڑیا بیٹھی دکھائی دی، انجم نے چڑیا کو ٹکٹکی باندھ کے دیکھنا شروع کیا۔ ان پرندوں کے جسم شاید پارے کے بنے ہوتے ہیں کہ بہت دیر تک ایک جگہ ٹک کر بیٹھ ہی نہیں سکتے، چڑیا اڑ کر سامنے والے بالاخانہ کی منڈیر پر جا بیٹھی۔ منڈیر کے سامنے کا حصّہ ٹوٹا ہوا تھا، چڑیا کی دُم نظر آرہی تھی، جسم کا باقی حصّہ ٹوٹی ہوئی اینٹوں میں چھپ گیا تھا۔ انجم کو اس نیم نظّارگی نے اور بے تاب کردیا، کھمبے کے پاس ہی تانوں کا کارخانہ تھا، وہ کارخانہ کے زینہ سے سیدھا چھت پر پہنچا، اس کے اوپر پہنچتے ہی چڑیا بالاخانہ کی بیچ کی کھڑکی پر آ بیٹھی، انجم بہت خوش تھا کہ چشم و نظّارگی کا فاصلہ بہت کم ہوگیا۔ کھڑکی سے ایک عورت نے انجم کو دیکھا کہ اُس کی نگاہیں بڑے شوق و بے تابی کے ساتھ کھڑکی کا طواف کررہی ہیں، آتشِ شوق کو تیز کرنے کے لئے کھڑکی بند کردی گئی، تھوڑی دیر بعد کھڑکی نیم وا ہوئی، آدھ کھلے دریچے سے عورت کی نگاہیں انجم کو دیکھ رہی تھیں، عورت کے مغرورانہ انداز میں جھنجلاہٹ اور حیرت کا اضافہ ہوگیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ نوجوان جسے وہ اپنا تماشائی سمجھی تھی، کسی اور طرف دیکھ رہا ہے۔ حسن اپنی شکست ہوتے دیکھ کر ہر اقدام کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔ دریچہ پوری طاقت کے ساتھ کھول دیا گیا، ایک حسین عورت، گھنی زلفوں کے سایہ میں انجم کے سامنے کھڑی تھی۔ انجم نے عورت کی طرف ایک بار یوں ہی سا دیکھا اور پھر چڑیا کی طرف متوجّہ ہوگیا، عورت نے سامنے کی میز پر رکھے ہوئے آئینہ میں چہرے کو

دیکھا اس احساس کے ساتھ کہ آج میرے چہرے اور شباب کی دل کشی میں کوئی کمی تو نہیں ہو گئی ؟ اُس کی آنکھوں نے جواب دیا نہیں نہیں کمی کیسی ! اور اضافہ ہو گیا ہے ۔ آج تو ! اتنی تنگ چولی اس سے پہلے کبھی زیب تن نہیں کی گئی ۔ یہ نوجوان یا تو اندھا ہے یا اس کے پہلو میں دل کی جگہ شیشہ کا ٹکڑا رکھا ہے جو وہ اتنی حسین و نوخیز عورت کی طرف متوجہ ہو کر اس قدر رنگین موقع سے فائدہ نہیں اُٹھاتا ـــــــــ عورت کے دل ہی دل میں سوال و جواب ہو رہے تھے ، احساسِ شکست و پسپائی تخیل کے خود ساختہ کھلونوں سے جی بہلا رہا تھا ۔ جوانی کی ندامت ہوائی قلعے بنا کر اپنے ٹھہراؤ کے لئے جگہ پیدا کر رہی تھی ۔ مگر دل کی خلش خالی خولی باتوں سے دُور نہیں ہوتی ، خیال آرائیاں بے تابی کو تسکین نہیں دے سکتیں ، کوئی آزمودہ کار سے آزمودہ کار سپہ سالار بھی شکست کھانے کے بعد صرف تخئیل کے زور سے شکست کو فتح سے نہیں بدل سکتا ۔ الفاظ ، باتیں اور نرے خیالات واقعات کا رُخ نہیں پھیر سکتے ۔

عورت آئینہ دیکھنے کے بعد خوب تن کر دریچے کی سلاخوں کو خالی انگلیوں سے تھام کر کھڑی ہو گئی ۔ انجم نے اس پر بھی اُس کی طرف نہ دیکھا عورت اندر چلی گئی اور آٹھ نو سال کے ایک بچے کو لے کر پھر وہیں آ گئی ۔

"کیا آپ کا کوئی کبوتر اُڑ کر ادھر آ گیا ہے" ـــــــ لڑکے نے انجم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور انجم دریچے کی طرف دیکھنے لگا ، ایک

نہایت حسین عورت اس کی نگاہوں کے سامنے تھی، نگاہیں دو چار ہوئیں۔
عورت کے لبوں پر مسکراہٹ آئی تھی کہ اس کا شوہر بالاخانہ پہ آگیا۔
عورت شوہر کو دیکھ کر سٹ پٹا گئی، انجم کی بے رخی نے اُسے گرفتہ خاطر اور
قریب قریب نا اُمید بھی کر دیا تھا، وہ دریچے کو بند کرتے ہوئے بولی:۔
"یہ سامنے جو مردوا کھڑا ہے، بہت دیر سے نہ جانے کیوں کوٹھی
کی طرف دیکھے جا رہا ہے؟!"
اس پر مرد نے عورت کو تو وہاں سے ہٹا دیا اور دریچے کے پٹ
کھول کر انجم پر برس پڑا۔
—— آپ اس چھت پر کھڑے کیا ملاحظہ فرما رہے ہیں؟ ——
مرد نے دریافت کیا۔
—— ایک خوبصورت چڑیا اس بالا خانے کی منڈیر پر بیٹھی ہوئی
تھی، اُسے دیکھنے کے لئے یہاں آگیا —— انجم نے جواب دیا۔
—— اوہ، تو آپ کو خوبصورت چڑیوں کی تلاش یہاں لیکر
آئی ہے —— مرد غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔
—— جی ہاں! پرندوں سے مجھے خاص دلچسپی ہے اور ......
...... انجم کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ شخص انجم کو خوب چلا
چلا کر گالیاں دینے لگا، محلّہ کے لوگ گلی میں جمع ہو گئے، انجم کے
چہرے سے معصوم ندامت برس رہی تھی۔ بے گناہی اُس کے گھبرائے
ہوئے تیوروں سے نمایاں تھی۔ مگر جس آدمی کو ایک عورت کا شوہر

یہ کہہ کر گالیاں دے رہا ہو کہ یہ میری بیوی کو چھت پر چڑھ کر تک رہا تھا تو وہ بے چارہ آدمی اپنی صفائی دے تو کس طرح دے! کوئی شریف انسان کسی خاص سبب کے بغیر اپنی بہو بیٹی کی نسبت اس قسم کی بات کہہ ہی نہیں سکتا، شوہر کی غیرت حقیقتِ حال سے بے خبر تھی۔ اس دُنیا میں جھوٹی سازشوں اور بے بنیاد تہمتوں نے بہت سے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔ غیرت بات کی باریکی اور معاملہ کی نزاکت میں جانے کی کوشش نہیں کرتی۔ یہ بارُود تو ذرا سی گرمی پا کر بھک سے اُڑ جاتی ہے۔ انجم کی طرح عورت کا شوہر بھی بے گناہ تھا جس نے یہ فتنہ کھڑا کیا تھا وہ دروازے کے پاس پسینہ میں بھیگی ہوئی انگلیاں چٹخا رہی تھی، ضمیر ملامت کر رہا تھا کہ تیری ہوس ناکی کے سبب ایک ناکردہ گناہ ذلیل اور رُسوا ہو رہا ہے۔ اور ہوس کہتی تھی کہ قدرت اُس نوجوان سے انتقام لے رہی ہے، موقع سے فائدہ نہ اُٹھانے اور نعمتوں کے ٹھکرانے والوں کا یہی حال ہوتا ہے۔

اس خود غرض دُنیا میں دوسرے کی ذلّت اور رُسوائی سے لوگ خوش ہوتے ہیں، بڑی سے بڑی نیکی بہت دنوں میں جا کر شہرت پاتی ہے مگر چھوٹی سے چھوٹی بُرائی چند دنوں میں طشت ازبام ہو جاتی ہے۔ نیکی کا پہاڑ بھی دُنیا کی نگاہ سے اوجھل رہتا ہے اور بُرائی کا تنکا بھی لوگوں کو نظر آجاتا ہے۔ دوسروں کی کمزوری اور عیب دیکھنے کے لیے دُنیا والوں کی آنکھیں خوردبین کا فرض انجام دیتی ہیں۔ نیکیاں

چھپائی جاتی ہیں اور بُرائیاں مشہور کی جاتی ہیں۔ خوبیوں کو بہت ہی ہلکا کر کے پیش کیا جاتا ہے اور کمزوریاں وزنی بنا دی جاتی ہیں۔ لوگ محاسن کے مقابلے میں معائب کو زیادہ اہمیّت دیتے ہیں۔ انجم کی سادہ اور بے داغ زندگی سے محلّہ والے واقف تھے۔ اس کا بھی سب کو علم تھا کہ انجم کو پرندوں کے پیچھے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا اور وہ ایک ذرا سی چڑیا کے لیئے قطب مینار پر ایک سانس میں چڑھ سکتا ہے مگر اس پر بھی لوگوں نے اس واقعہ کو طرح طرح کے رنگ دے کر اچھا خاصہ افسانہ بنا دیا۔ محلّہ کے ہنسوڑ اور من چلے نوجوان انجم کو سُنا سُنا کر آپس میں کہتے کہ چڑیوں کے بہانے سے یار لوگ دوسروں کی بہو بیٹیوں سے آنکھیں لڑاتے ہیں، کوٹھوں پر چڑھ چڑھ کر نظارہ بازی کی جاتی ہے، بالاخانہ کے دریچوں کی تاک جھانک ہوتی ہے۔

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ مارنے والے کا ہاتھ روکا جا سکتا ہے مگر کہنے والے کا مُنھ بند نہیں کیا جا سکتا، تو بے چارہ انجم کس کس کی زبان روکتا، کہاں کہاں صفائی پیش کرتا، کس کس کو اپنا دل چیر کر دکھاتا، اُس نے اب پرندوں کے تعاقب میں کوٹھوں، چھتوں، منڈیروں اور بالاخانوں پر چڑھنا اور دیکھنا چھوڑ دیا، شوق بار بار اُسے اُبھارتا۔ اُکساتا اور آمادہ کرتا۔ مگر رُسوائی کا خیال شوق کو دبا دیتا۔ وہ تلملا تلملا کر اور بے چین ہو ہو کر رہ جاتا۔ شوق و تمنّا کی پامالی پر ہر کسی کا دل دُکھتا ہے۔ انجم کو بھی یہ جام تلخ گوارا کرنا پڑا۔ اب وہ اپنا شوق پورا

کرنے کے لئے جنگل کی سمت نکل جاتا اور پرندوں کے پیچھے گھنٹوں گھومتا شہر کا ماحول اُس کے شوق کے لئے ناسازگار ثابت ہوا۔ اس واقعہ کے بعد بھی اُس کے شوق میں کمی نہیں ہوئی، بس اتنا ہوا کہ شوق و محبت کی جولانگاہ پہلے بستی تھی، اب بستی کی جگہ جنگل نے لے لی۔ جنگل بستی سے زیادہ وسیع ہوتا ہے اس لئے انجم کے شوق نے وسعتِ صحرا کو دیکھ کر اور پاؤں پھیلا دیئے۔

انجم کے والد اگر رشتہ کے لیے زیادہ چھان بین نہ کرتے تو اب سے کئی سال پہلے اُس کی شادی ہو گئی ہوتی۔ بڑے میاں دولت، خوبصورتی، شرافتِ خاندانی اور علم کی تلاش میں تھے اور اس زمانہ میں یہ تمام خوبیاں ایک جگہ مشکل ہی سے ملتی ہیں۔ کہیں خوبصورتی ہوتی ہے تو دولت نہیں ہوتی، کسی جگہ علم ہوتا ہے تو شرافتِ نسبی نہیں ملتی۔ بیٹا جوان ہو چکا تھا اُس کی شادی بہرحال کہیں نہ کہیں کرنی ہی تھی۔ بڑی کدوکاوش اور تلاش وجستجو کے بعد ایک جگہ رشتہ طے ہو گیا۔

انجم سے جس لڑکی کی نسبت ٹھہری تھی وہ انگریزی کے اعلےٰ امتحانوں میں کامیابی حاصل کر چکی تھی، دولتِ حُسن کے ساتھ دولتِ مال وزر بھی میسّر تھی۔ شرافت اگر خاندان کی وجاہت کا نام ہے تو اُس کے باپ کے یہاں ہرن کی کھال پر لکھا ہوا نسب نامہ موجود تھا۔ لیکن شرافت اگر اہلِ خاندان کے کردار اور اطوار کا نام ہے تو اُس کا یہ حال

اعتدال پر نہیں ہے۔ ایک براتی نے انجم کی شیروانی کا دامن آہستہ سے کھینچ کہ بیٹھ جاؤ۔
انجم اس پر دامن کو جھٹکا دے کر بولا :-
"ایسے پرندے روز روز دیکھنے کو نہیں ملتے۔ ہیرے اور موتیوں میں تولنے کے
قابل ہے یہ چڑیا! میں نے کشمیر میں اسی طرح کی ایک چڑیا دیکھی تھی اُس کا رنگ اس
چڑیا سے کچھ زیادہ گہرا تھا"
چڑیا کمرے سے اُڑ کر باہر چلی گئی اور انجم نے قدم اُٹھایا ہی تھا کہ اُس کے پاس
کے لوگوں نے اُسے روک دیا۔ انجم اس پر کہنے لگا، بھئی میں تھوڑی دیر کے لئے
باہر جانا چاہتا ہوں، ابھی آتا ہوں، وہ چڑیا باہر کسی درخت کی ڈالی پر بیٹھی ہوگی
اتنی دیر میں قاضی صاحب رجسٹر کے خانے بھر کر تیار کر لیں گے۔ خُدا کے لئے مُجھے
نہ روکو، میں دولھا بن کر کچھ اور نہیں ہو گیا۔
لڑکی والوں میں کانا پھوسی ہونے لگی کہ دولھا کسی دماغی مرض میں مبتلا ہے،
لڑکی کے چچا نے اس شبہ کو اور زیادہ قوی بنا دیا۔ لڑکی کے باپ نے قاضی
سے کہا کہ ٹھہریئے ابھی نکاح نہیں ہوگا۔ لڑکی اور لڑکے والوں میں تو تو میں میں ہونے
لگی، لڑکے والوں کی طرف سے کہا گیا کہ دولھا بالکل تندرست ہے۔ اُسے
پرندوں سے خاص دلچسپی ہے۔ نئے پرندکو دیکھ کر وہ بے تاب ہو جاتا ہے۔
لڑکی والوں نے جواب دیا کہ پاگلوں کے اور کیا سینگ ہوتے ہیں۔ ایک دولھا کا
پرندکو دیکھ کر شادی کی مسند سے اُٹھ کر بھاگنا دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے۔ جو آدمی
چڑیوں کو دیکھ کر اس قدر بدحواس اور بے قابو ہو جائے اُس کی دیوانگی میں اور کسر
کس بات کی ہے۔ سب دیوانے پتھر ہی تو نہیں مارتے اور گریبان چاک نہیں

تھا کہ انجم کی منگیتر کی چچا زاد بہن نے ایک پارسی پروفیسر کے ساتھ سول میرج کر لی تھی، لڑکی کے بڑے بھائی کے گھر میں جو عورت تھی اُس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنے پہلے شوہر سے لڑکر میکے چلی آئی طلاق نہیں ہوئی اور اُس نے دوسرا بیاہ رچا لیا۔ خاندان میں عورتیں عام طور پہ پردہ کرتی ہیں مگر ڈاکٹروں، پروفیسروں، اسکول ماسٹروں، اور گھر کے مردوں کے بعض دوستوں کے سامنے بے پردہ ہو جاتی ہیں۔

انجم کی منگیتر کے لئے اُس کے چچا زاد بھائی کا بھی پیام تھا۔ مگر لڑکی کے باپ نے انجم کے پیام کو ترجیح دی، لڑکی کے چچا بھائی کے انکار پر خاموش ہو کر رہ گئے۔ ناراضی اور خفگی کا اظہار کرتے تو اور سُبکی ہوتی۔ بیاہ کی تاریخ مقرر ہوئی، بارات گئی اور انجم مسندِ نوشہی پہ دولہا بنکر بیٹھ گیا۔ براتی نوشاہ کو گھیرے بیٹھے تھے، مخملی قالین کی زرتیں عدودوں کے قریب بادام، مصری اور خشک کھجوروں کے طباق رکھے تھے، قاضی نے نکاح کے رجسٹر کی خانہ پُری شروع کر دی تھی، اتنے میں ایک رنگ برنگی چڑیا باہر سے اُڑ کر برات کے کمرے میں آگئی۔ انجم نے چڑیا کے پروں پر نگاہیں جما ہی تو دیں۔ لڑکی والے دولھا کے اس انداز کو غور کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ چڑیا الماری کے طاق سے اُڑ کر برقی پنکھے پر بیٹھ گئی، اُس کا جسم صاف طور پہ نظر نہ آتا تھا۔ انجم چڑیا کو دیکھنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ دُلہن کے چچا جن کے لڑکے کا پیام ٹھکرا دیا گیا تھا لڑکی کے باپ کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ اور اُنگلی سے اپنے دماغ کو ٹھوکا دیا یعنی یہ کہ دولھا کا دماغ

کیا کرتے۔ نوشاہ کا پہرہ تو دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوتا تو خیر دماغ کی خرابی کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے، کسی آدمی کا موقع کے خلاف ہنسنا اور رونا بھی دیوانگی ہے۔

دونوں طرف سے رسّہ کشی ہونے لگی، باتوں کی تلخی بڑھتی ہی چلی گئی۔ خاندانی شرافت کا ذکر درمیان میں آگیا۔ بیٹے والوں نے کہا، ہمارے خاندان کا دور دور جواب نہیں، بیٹی والے بولے ہم تم سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ بادشاہوں کی عطا کی ہوئی سندیں ہمارے یہاں موجود ہیں۔ یعنی مفاخرت نے سوال وجواب اور تائید و تردید کی صورت اختیار کرلی۔ بات میں بات نکل آئی، دولہا والوں نے کہا کہ ہمارے لڑکے کے لیے سَو لڑکیاں ہم نے تو تمہارے اصرار کرنے پر اس رشتہ کو قبول کرلیا تھا۔ دوسری طرف سے جواب ملا کہ پہل تمہاری طرف سے ہوئی تھی، ہم تو اس رشتہ کے لیے راضی نہ تھے تم نے سفارش کرکے، اثر ڈلوا کر منّت بوں کہیے سیکڑوں منتیں کرکے رشتہ طے کرایا۔ لڑکی کے باپ نے آخر میں یہاں تک کہہ دیا کہ میں اپنی لڑکی کو ایک پاگل کے پلّے باندھ کر اس بے چاری کی زندگی تباہ کرنا نہیں چاہتا۔ انجم کے گھر والوں نے اس کے جواب میں بہت سخت سُست باتیں کہیں یہاں تک کہ دونوں طرف کے آدمی گالی گلوج پر اُتر آئے۔ وہ تو یہ کہیے کہ دو چار صلح پسند آدمی وہاں اتفاق سے موجود تھے جنھوں نے بیچ میں پڑکر معاملہ کو زیادہ بڑھنے نہ دیا ورنہ ہاتھا پائی کی نوبت آچکی تھی اور اس شور وشر میں تھوڑی بہت جھٹک پٹک ہو چکی تھی۔

بیاہ کی محفل کا ذرا سی دیر میں جغرافیہ ہی بدل گیا چھوارں کے طباق پھولوں کی جھالر، نقرئی اُگالدان اب محفل میں نظر نہ آتے تھے اُجڑے ہوئے دل ٹوٹ چکے تھے۔ تعلقات میں انتہائی تلخی پیدا ہو چکی تھی متبسم نگاہوں میں نفرت اور غصہ جھلک رہا تھا، دوستی، محبت اور تعلقات کے بڑھے ہوئے ہاتھ کھینچ لئے گئے، دولھا کے سہرے کے پھول اور دولہن کے ہاتھوں کی مہندی خوشی کی ایک بہار بھی نہ دیکھ سکی۔ دل کی تمنائیں دل ہی میں رہ گئیں۔ زنانہ مکان میں خبر پہنچی کہ دولھا باگل نکلا شادی نہیں ہو گی، برات اُلٹے پاؤں واپس چلی گئی، اس خبر کے سُنتے ہی مسکراہٹیں حیرت اور افسردگی سے بدل گئیں، دُلہن کی سہیلیوں کی چھیڑ چھاڑ پر اوس سی پڑ گئی۔ گیت گانے والیوں کے گلوں میں گیتوں کے بول اٹک کر رہ گئے، زمزموں، نغموں، چہل پہل اور چہلوں پر فالج سا گر پڑا، عورتیں ایک دوسرے کا منھ تکتی تھیں۔ مسرت و شادمانی کی بساط ہی اُلٹ گئی، خوشی کا سارا نقشہ ہی بدل گیا۔ تمناؤں کی محفل ہی درہم برہم ہو گئی۔

انجم کے گھر میں خوشیاں ہو رہی تھیں کہ بھاری جہیز کے ساتھ چاند سی دُلہن گھر میں آئے گی، برات کے واپس ہونے پر جب معلوم ہوا کہ شادی نہیں ہو سکی، نکاح کے وقت جھگڑا ہو گیا، دولھا خالی ہاتھ آرہا ہے تو خوشی کے گھر میں سوگ سا طاری ہو گیا، انجم کی بہنیں جو خوشی کے مارے تتلی کی طرح بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں یہ خبر سُن کر بالکل سناٹے میں گُم صُم ہو گئیں جیسے کسی نے اُن کے جسموں سے روح کھینچ لی۔ گلوں کے

پر زردی چھاگئی، قہقہوں کا گلا گھٹ کر رہ گیا۔ گریۂ بے اشک اور ماتم بے فریاد نے محفلِ طرب کو انجمنِ غم بنا دیا۔

برات کا دُلہن کے گھر سے اِس طرح واپس چلا آنا یقیناً رسوائی اور ذلّت کا باعث تھا، دُشمنوں نے حقیقتِ حال کو رنگ دے کر جھوٹ کا ایک محل کھڑا کر دیا۔ کہا گیا کہ انجم کے باپ یوں ہی برات لے کر لڑکی والے کے یہاں جا دھمکے تھے، شادی کی بات پکّی نہیں ہوئی تھی، بیٹی والوں نے براتیوں کی خوب مرمّت کی اور یہ لوگ پِٹ پٹا کر وہاں سے لوٹے ہیں کسی نے کہا کہ انجم کے باپ یہاں تو بڑے شریف بنتے ہیں کہ ہمارا خاندان شہر میں زیادہ مستند اور معزز خاندان ہے، بیٹی والے کے یہاں جا کر جب چھان بین ہوئی تو پتہ چلا کہ یہ قلعی گر اپنے کو شیخ قریشی کہتے ہیں۔ کوئی بولا کہ انجم کی بدچلنی بیٹی والوں پر ظاہر ہو گئی، اور صاحب! جو شخص پردوں کے بہانے سے پرائی بہو بیٹیوں کو کوٹھوں پر چڑھ چڑھ کر دیکھتا ہو، وہ نیک چلن ہو ہی نہیں سکتا۔ غرض جتنے منہ اُتنی باتیں! شہر میں اسی بات کے ہر جگہ چرچے ہو رہے تھے۔

انجم کے باپ کو اپنی ذلّت کا بہت زیادہ احساس تھا، ان کو کیا سارے براتیوں کو معلوم تھا کہ دولھا میاں کے شوقِ پردہ نوازی کی بدولت یہ ذلّت دیکھنی نصیب ہوئی۔ مگر وہ آدمی عقلمند اور صاحبِ ظرف تھے، انجم سے اُنھوں نے ایک حرف بھی نہیں کہا۔ وہ دل ہی دل میں گھٹ رہے تھے اور انتہائی ضبط کے باوجود دل کی خلش اُن کے تیوروں سے

ظاہر ہو رہی تھی ۔ بناوٹی مسکراہٹیں دل کی خرابیوں کو چھپا نہیں سکتیں ۔ اندر کا غم باہر کی خوشی سے دب نہیں سکتا ۔ انجم باپ کی قلبی واردات کو اچھی طرح محسوس کر رہا تھا ، باپ کی ذلّت بیٹے کی ذلت تھی ۔ دُنیا میں یہی تو وہ رشتہ ہے جس میں خود غرضی ، اجنبیت اور تکلف کی ذرا سی بھی آمیزش نہیں ہوتی ، دُنیا کا ہر رشتہ ٹوٹ سکتا ہے مگر یہ رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا ۔ اپنے دل و جگر کے ٹکڑے اور آنکھ کے نور کو کوئی بھی اپنے سے جُدا نہیں کر سکتا ۔

انجم کو خود اپنے پر طیش آ رہا تھا کہ نہ مجھے پرندوں کا اتنا شوق ہوتا اور نہ یہ بات ظہور میں آتی ۔ اُس کا دل کہہ رہا تھا کہ اس سارے بگاڑ اور فساد کا مجرم تو ہے ۔ انجم پشیمان تھا اور بہت زیادہ پشیمان تھا ، لوگوں سے آنکھیں ملاتے ہوئے اُسے شرم اور خفت محسوس ہوتی تھی ۔ انجم نے شرم کے مارے بیاہ شادیوں میں جانا چھوڑ دیا تھا ۔ بارات کے جلوس کو دیکھ کر وہ شرمندہ سا ہو جاتا ، باجوں کی آواز سُن کر اُسے وحشت سی ہونے لگتی ۔ شادی بیاہ کے رقعوں کو پڑھ کر وہ محسوس کرتا کہ یہ اُس کی ندامت اور پشیمانی کا منھ چڑایا جا رہا ہے ۔ لوگوں کی طنز آمیز نگاہوں کے چرکے اُسے رفو کھلنے پڑتے ۔ بوڑھے باپ کی خموشی ، جو اُن کے دلی غم کی ترجمان تھی ، انجم کے لئے اور سوہانِ روح اور تکلیف دہ تھی ۔ کوئی سپوت بیٹا اپنے باپ کی پریشانی نہیں دیکھ سکتا ۔ مگر اب ہو بھی کیا سکتا تھا ، آنسوؤں کے دریا بھی گزرے ہوئے حادثے کے کسی دُھندلے سے نقش کو بھی نہیں مٹا سکتے ۔ فریاد و ماتم سے تلافیِ مافات نہیں ہو سکتی ۔

انجم نے بہت کچھ غور و خوض کرنے کے بعد چند دن کے لئے وطن سے باہر جانے کا تہیہ کر لیا۔ انجم کے ایک دوست پٹنہ کی ایک فرم میں منیجر تھے اُن کے توسط سے انجم کو ایجنسی کا کام مل گیا۔ انجم کے باپ بہت خوش حال تھے۔ اگر وہ باپ سے کہتا کہ میں روزگار کے لئے باہر جا رہا ہوں تو وہ قیامت تک ہامی نہ بھرتے۔ انجم دوست سے ملنے کا بہانہ کرکے وطن سے روانہ ہوا۔ کیا انجم نے باپ کو دھوکا دیا؟ ہاں دھوکا دیا مگر بے ضرر بلکہ مُفید دھوکا! اس دُنیا میں حادثات اور واقعات سے مجبور ہو کر آدمی اپنے دوستوں، بزرگوں، خیر خواہوں اور جگر پاروں سے بناوٹی برتاؤ کرنے پر مجبور رہ جاتا ہے۔ رازدار سے رازدار دوست سے بعض وقت دل کی بات اور ارادہ چھپایا جاتا ہے۔

پٹنہ پہنچنے کے بعد انجم نے باپ کو خط لکھا:-

—— ابّا جان!

میں اپنی حماقت پر انتہائی نادم ہوں، اور میرا دل آپ کے غمِ خاموش پر روتا ہے۔ میں چند دن کے لئے آپ کے قدموں سے دُور رہنا چاہتا ہوں، میں نے حالات کا پُورے طور پر اندازہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے، میرا یہ فیصلہ آپ کی آخری منظوری کا منتظر ہے۔ وطن میں میرے نہ رہنے سے "وہ" چرچے بھی کم ہو جائیں گے۔ یہاں ایک دوست کی مہربانی سے مُجھے ایک فرم کی ایجنسی مل گئی ہے، مستقبل اُمید افزا نظر آتا ہے۔ آپ کی دُعاؤں کی ہر وقت ضرورت ہے۔

انجم ذہین تھا، محنتی تھا اور ساتھ ہی دیانت دار بھی۔ تجارتی کاروبار میں ان اوصاف کی بدرجہ اتم ضرورت ہوتی ہے۔ بددیانت کاروبار کبھی پنپ نہیں سکتا، تھوڑے دنوں کے لئے تو اُس کے خوب گھرے رہتے ہیں۔ لیکن خبثِ نفس کا بھانڈا بہت جلد پھوٹ جاتا ہے، بازار میں ساکھ باقی نہیں رہتی اور کوئی دو کوڑیوں کو نہیں پوچھتا۔ انجم نے بڑی دیانت داری اور تن دہی کے ساتھ کام کیا۔ اور تجارت پیشہ لوگوں میں اُس کی ساکھ قائم ہو گئی۔ جہاں تک زندگی کی آسائش کا تعلق ہے وہ پٹنہ میں بہت آرام کے ساتھ رہنے لگا۔ گھر پر اتنی سہولتیں اُسے میسر بھی نہ تھیں۔ روپیہ اُس کے ہاتھوں میں کھیلتا اور دولت بصورت دکان اور کارخانہ کے دروازہ پر خیر مقدم کے لئے پہلے سے کھڑی رہتی

وقت بہت ہی گریزپا ہے، پلک مارتے جگ بیت جاتے ہیں۔ انجم کو پٹنہ میں ایک سال ہو گیا، گھر جانے کا اُس نے کئی بار ارادہ کیا۔ لیکن کاروبار کے پھیلاؤ نے ہر بار اُس کا دامن تھام کر کہا کہ اس کام کو نپٹا لو تو جانا اور:۔

سعد کارِ دُنیا کسے تمام نہ کرد

مرتے دم تک "کام" آدمی کا پیچھا نہیں چھوڑتے، دُنیا کے کاروبار کا سلسلہ طولانی نہیں لامتناہی ہے۔ ایک کام پورا ہوتے ہوتے دوسرے کام کی بنیاد رکھ دیتا ہے۔ آدمی حساس اور فرض شناس ہو تو ایک لمحہ کی فرصت بھی اس دنیا میں میسر نہیں آسکتی جب ہاتھ پاؤں کام نہیں کرتے تو دماغ کام کرتا ہے۔ تصورات خاکے بناتے ہیں۔ تخیل بُت تراشتی ہے اور ذہن تمناؤں کے قلعے تعمیر کرتا ہے۔ انجم باوجود کوشش کے پٹنہ سے نہ جا سکا۔ کاروبار کی اُلجھنیں تھیں دامن کے سہارے بڑھتی ہی چلی گئیں۔

انجم نے دیرآشنا طبیعت پائی تھی، نئے آدمیوں سے وہ بہت دنوں میں بے تکلف ہوتا۔ اُس کا مزاج بچپن ہی سے کم آمیز تھا۔ اس خود غرض دُنیا میں سچے دوست اور مخلص احباب ناپید سے ہیں، ہنسی، مذاق، تفریح اور دل لگی کے لئے بیسیوں دوست مل سکتے ہیں مگر کام کے وقت ہاتھ بٹانے اور غمخواری کرنے کے لئے مشکل ہی سے کوئی دوست مل سکے گا۔ آج کل تاجرانہ دوستی کی گرم بازاری ہے، انجم کی یوں تو سیکڑوں آدمیوں سے جان پہچان اور ملاقات تھی مگر اُس کے بے تکلف دوست دو چار سے زیادہ نہ تھے۔ کاروبار سے فارغ ہوتا تو وہ دوستوں کے گھر چلا جاتا یا کوئی دوست اُس کے یہاں آجاتا، ہنسی خوشی کی باتیں ہوتیں، چائے یا شربت کے دور چلتے اور تھوڑی دیر کے لئے دل بہل جاتا۔ انجم کلب گھر کا ممبر بن چکا تھا، وہ بھی ایک دوست کے اصرار کرنے پر، کلب گھر وہ کبھی کبھار جاتا، مغرب زدہ ماحول سے اُس کو اُلجھن سی ہوتی تھی۔ ایک سال کی مُدّت تھوڑی نہیں ہوتی، اتنی مدّت میں فکر و غم اور خیال و تصوّر کا نقشہ بدل جاتا ہے مگر انجم بارہ مہینے اور تین سو ساٹھ دن گزرنے کے بعد بھی اپنی حماقت پر متاسّف اور پشیمان تھا۔ اُس واقعہ کے بعد پرندوں سے اُس کو پہلی سی دلچسپی نہ رہی تھی، پہلی ہی ٹھوکر میں اُس کی آنکھیں کُھل گئیں۔ پٹنہ آنے کے بعد یہ شوق قریب قریب ختم ہو گیا۔ مگر فطرت اور مزاج میں پرندوں کا شوق اس قدر رسوخ حاصل کر چکا تھا کہ اب بھی پرندوں کو دیکھ کر وہ کھو سا جاتا تھا۔ پرندے کو دیکھ کر اُسے اپنا دولھا بننا یاد آجاتا کہ کس طرح اُسے دُلہن کے گھر سے ناکام واپس آنا پڑا، اُس کے باپ کی ذلّت ہوئی، شہر میں چرچے ہونے لگے، وہ گھر سے نکلتا تو لوگوں کی اُنگلیاں اُٹھتیں کہ

یہ بن بیاہے دولہا تشریف لئے جارہے ہیں، یہ تصوّرات اور احساسات اُس کے شوق کو اُبھرنے نہ دیتے۔ بار بار دبائے جانے اور پامال کئے جانے سے شوق کی شدت مجروح اور نڈھال ہو جاتی ہے۔

کلب گھر کے ممبروں سے انجم کی گہری شناسائی نہ تھی۔ کلب میں آنے جانے اور اُٹھنے بیٹھنے سے بے تکلفی بڑھتی ہے، وہ بس صورت آشنا تھا۔ دو چار سے البتہ جان پہچان تھی۔ ایک دن شام کو وہ کلب گھر پہنچا، لوگ تفریح میں مشغول تھے، کہیں برج کھیلا جا رہا تھا، کوئی بلیرڈ ٹیبل پہ مشق کر رہا تھا، کسی کے سامنے میز پہ کافی کی پیالیاں رکھی تھیں، کہیں قہقہے بلند ہو رہے تھے، کوئی ریڈیو سُن رہا تھا، اور کچھ خوش باش نوجوان حسین عورتوں کے جُھرمٹ میں داد عیش دے رہے تھے یا یوں کہیے دامنِ نگاہ میں حسین نظاروں کی دولت سمیٹ رہے تھے۔

انجم عریب میز کے قریب، کرسی پر بیٹھ گیا اور اخبار پڑھنے لگا۔ پہلا صفحہ پڑھ کر جو اُس نے ورق اُلٹتے ہوئے بائیں جانب دیکھا تو ایک نہایت ہی خوبصورت عورت ایک مرد کے ساتھ بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ شہابی رنگ، کتابی چہرہ، درمیانی قد، گداز جسم، اور لباس . . . . شباب کی تمام حشر سامانیوں کا لحاظ کر کے لباس پہنا گیا تھا، بنارس کی بے شمار صبحیں اُس قتالۂ روزگار کی مسکراہٹ کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی تھیں اور اودھ کی اَن گنت شامیں اُس کے بکھرے ہوئے بالوں کو سجدہ کر رہی تھیں۔ انجم نے عورت کو بار بار دیکھا اور شوق و توجہ کی نگاہ سے دیکھا، شوقِ نظارہ کے اس عالم میں اُسے خیال آیا

کہ میری اس نظر بازی کو دوسرے لوگ دیکھ کر میرے متعلق بُری رائے قائم کریں گے، اس خیال کے آتے ہی وہ اخبار پڑھنے لگا، خبر بھی بہت سنسنی خیز قسم کی تھی، خبر پڑھنے کے بعد اُس نے عورت کی طرف پھر دیکھا مگر اب اُس کی نگاہوں کو مایوس واپس ہونا پڑا، عورت اور مرد دونوں وہاں سے جا چکے تھے، کرسیاں خالی تھیں اور ادھ جلی سگرٹ سے دھواں نکل رہا تھا، انجم نے اُس پری وش نازنین کو وہاں نہ پا کر خلش سی محسوس کی، اُس کی آنکھیں کلب گھر کے بام و در کو حسرت کے ساتھ دیکھنے لگیں، تھوڑی دیر تک وہ خاموش بیٹھا رہا اور پھر اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ اُس نے اخبار پڑھتے میں کئی بار ادھر اُدھر دیکھا، مگر شوقِ نظارہ کو ہر دفعہ ناکامی ہوئی۔ اخبار پڑھتے میں خیال آیا کہ اگر اتنی حسین عورت سے شادی ہو جائے تو زندگی جنت بن جائے۔ مگر دوسرے خیال نے اس خیال کی فوراً تردید کر دی کہ اس قدر خوبصورت بیویاں قسمت والوں کو ملتی ہیں، تیسرے خیال نے دوسرے زاویۂ نگاہ سے تنقید کی۔ میاں! کیسی ناتجربہ کاروں کی سی باتیں کر رہے ہو اس ہوس پرست دنیا میں اتنی حسین بیوی کو کہاں، کس طرح اور کس کس سے چھپا کر رکھو گے۔ بدگمانی اور رشک و رقابت کی شدت سے کلیجہ شق ہو جائے گا۔

انجم اخبار پڑھنے کے بعد لائبریری کے کمرے کی طرف روانہ ہوا، کلب کے تمام لوگ تفریح میں ڈوبے ہوئے تھے، لائبریری کلب گھر کے آخری حصہ میں تھا وہاں پہنچنے کے لیے دو برآمدوں سے گزرنا ہوتا تھا، پہلے برآمدے کے ایک گوشہ میں چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے ایک دریچہ میں خوبصورت جالی لگی تھی، انجم نے

جاتے ہوئے دیکھا۔ کہ وہی عورت اُسی مرد کے ساتھ کمرے میں باتیں کر رہی ہے۔
وہ دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا، باتوں کی آواز صاف آ رہی تھی۔ انجم کا مقصد
باتیں سُننا نہیں بلکہ دیکھنا تھا، لیکن جس کو دیکھ کر نگاہیں لطف حاصل کرتی
ہیں اُس کی باتیں بھی کانوں میں رس ٹپکاتی ہیں۔—— اُن کی باتیں:—

"میں سچ کہتی ہوں مجھے اپنے شوہر سے ایک دن کے لیے بھی دلچسپی
نہیں ہوئی۔ میں تو بس تم کو چاہتی ہوں"

تو یہ بیاہ تمہاری مرضی کے خلاف کر دیا گیا۔

مجھ سے مشورہ ہی کب کیا گیا تھا، ڈارلنگ! میرا بیاہ تو ایک اور
جگہ ٹھہرا تھا مگر عین نکاح کے وقت پتہ چلا کہ دولھا پاگل ہے۔ (اس جملہ کو
سُن کر انجم کی سانسیں تیز ہو گئیں اور اُس نے بڑی احتیاط کے ساتھ سانسوں
کو روکا۔)

تو کیا نکاح کے وقت دولھا کے دماغ کا امتحان کرایا گیا تھا۔
(مُسکراہٹ)

جی نہیں۔ ہوا یہ کہ جس کمرے میں نکاح کا انتظام ہو رہا تھا وہاں
ایک چڑیا باہر سے اُڑ کر آ گئی، دولھا اُسے دیکھ کر دیوانہ وار پکڑنے کے
لیے دوڑا اور پاگلوں کی سی باتیں کرنے لگا۔ ابا جان نے کہا کہ ایسے خبط الحواس
آدمی کے ساتھ میری لڑکی کا بیاہ نہیں ہو سکتا۔ آئی ہوئی بارات واپس ہو گئی
اور میری شادی دوسری جگہ کر دی گئی۔

عورت کی باتیں سُن کر انجم نے محسوس کیا کہ اُس کی آنکھوں سے بہت سی

پردے یکبارگی اُٹھ گئے اور کسی نے اُس کے زخم پر مرہم رکھ دیا۔ وہ کاسب گھر سے تیزی کے ساتھ مکان پہنچا اور جاتے ہی والد کو خط لکھا :-

ابّا جان !

میں تین چار دن میں گھر پہنچ رہا ہوں۔ پٹنہ آنے کے بعد میں نے لکھا تھا کہ میں اپنی حماقت پر نادم ہوں مگر آج عرض پرداز ہوں کہ مجھے اپنی حماقت پر فخر ہے، میری اُس دن کی حماقت نے خاندان کی آبرو اور عزت کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ آپ مجھے مبارکباد دیجئے میں آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ذرا سی دیر کی جگ ہنسائی ہمیشہ کی رُسوائی اور ذلّت کا کفّارہ بن گئی۔ ابّا جان! میں آج بہت خوش ہوں، زندگی بھر مجھے اتنی خوشی نہیں ہوئی۔ ارض و سماوات مجھے تہنیت دے رہے ہیں اور میری خوشی جھوم جھوم کر سب کی تہنیت قبول کر رہی ہے۔

دو تین دن میں ضروری کام نبٹا کر، انجم وطن روانہ ہو گیا، اب سے ایک سال پہلے جب اُس نے وطن چھوڑا تھا تو اُس کے دل پر ندامت اور خفّت کے پہاڑ دھرے تھے مگر آج اُس کی آنکھوں میں فاتحانہ مسرت جھلک رہی تھی اور اُس کا دل پھول کی طرح ہلکا اور شادماں تھا۔ وہ آپ ہی آپ باتیں کرتا، گنگناتا اور مسکراتا، اور اگر وہ موزوں طبع ہوتا تو آج اتنی اچھی نظم کہہ سکتا تھا کہ دنیا اُسے پڑھ پڑھ کر جھومتی اور ٹیگور بھی اُس پر فخر کرتا، اگر وہ افسانہ نگار ہوتا تو اتنا دلچسپ اور شاہکار افسانہ لکھ سکتا تھا کہ پڑھنے والے اُسے پڑھ کر وجد میں آجاتے اور اُس کی شوخیٔ تحریر اور اندازِ بیان کی دُنیا میں دھوم مچ جاتی

افسانہ نگار کے ذاتی واردات افسانہ کے قالب میں ڈھل کر قیامت آخریں بن جاتے ہیں۔ مگر قدرت نے یہی مقدّر کر دیا تھا کہ اُس کے واقعہ کو دوسرے لکھیں، اور اُس کی کہانی اوروں کی زبانی سُنی جائے۔ مُقدّرات بدل نہیں سکتے، کاتبِ تقدیر کے ایک نُقطہ کو بھی کونین کی تمام قوتیں مل کر اِدھر سے اُدھر نہیں کر سکتیں، جس کو جو کام سونپ دیا گیا ہے وہ اُسی کے لئے مخصوص ہے، تقدیر کی حدوں سے کوئی آگے جا نہیں سکتا۔ قدرت کا یہی انتظام اور تقدیر کا فیصلہ آج انجم کی کہانی کاغذ پر منتقل کرا رہا ہے۔

یوں دیکھنے کو سیاہی کے یہ چند نقوش ہیں جن کو ہم "الفاظ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر اِس افسانہ کے ہر لفظ میں انجم کے دل کی دھڑکنوں کو بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسانہ نگار نے اپنی بساط بھر ترجمانی کا حق ادا کر دیا۔ اب پڑھنے والوں کی باری ہے، پڑھیئے اور محسوس کر کے پڑھیئے، پرندوں کے شیدائی انجم کے اس افسانہ کی روح زبان حال سے کہہ رہی ہے۔ بلکہ پیام دے رہی ہے، ـــ

گر بُلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بُلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

بے گناہ ڈاکو

جیسے جیسے دُنیا بدل رہی ہے اُسی رفتار سے موسم بھی بدل رہے ہیں۔ سائنس نے وقت اور فاصلہ (Time and Space) کی رفتار گھٹا کر شاید موسمی کیفیت کو بھی کچھ سے کچھ بنا دیا ہے۔ اگر انقلاب کی یہی رفتار رہی تو کیا عجب ہے کہ تنظیم کواکب اور نظام شمسی ہی سرے سے بدل جائے، ثوابت گھومنے لگیں، سیّارے جامد ہوجائیں اور زمین اپنے محور سے ہٹ کر گردش کرنے لگے۔ ساون بھادوں کے مہینوں میں اب دُھواں دھار بارش نہیں ہوتی، جنوری کے مہینہ میں دھوپ ناگوار معلوم ہوتی ہے، حالانکہ اس مہینہ میں دُھوپ تو کیا آگ کے شعلے خوشگوار محسوس ہونے چاہئیں۔ دُنیا والوں کی سیاہ کاریوں نے قُربِ قیامت کے آثار ہویدا کر دیئے ہیں۔ نہ جانے کس دن حضرتِ اسرافیلؑ صور پھونک دیں اور قیامت آجائے۔ اس سنسار میں اب پاپ ہی پاپ اور بُرائیاں ہی بُرائیاں دکھائی دیتی ہیں، درندگی، بے غیرتی، اور ہوس پرستی کا نام لوگوں نے آرٹ (Art) رکھ لیا

ہے دُنیا والوں کی بدنیتی کا پھل تو مل رہا ہے کہ ساون کا پورا مہینہ بیت گیا اور ایک دن بھی کھُل کر مینھہ نہیں برسا، ترشح سے تو تپتی زمین میں اور آگ لگ جاتی ہے، اُودی گھٹائیں لہرا لہرا کر رہ جاتی ہیں مگر بارش نہیں ہوتی" کیا بادلوں اور گھٹاؤں سے قدرت نے مینھہ برسانے کی قابلیت چھین لی یہ کڑکتی بجلی اور گرجتے بادل گیا سا کتانِ خطۂ پاک سے مذاق کرتے ہیں؟ - - - - - - آفتاب اسی قسم کے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا یہاں تک کہ اُسے نیند آگئی -

رات میں بادل گرجا، بجلی کڑکی اور بارش بھی ہوئی مگر آفتاب کی آنکھ نہ کھُلی، جوانی کی نیند تو پوں اور بندوقوں کی آواز سے بھی نہیں اچٹتی - صبح کے وقت اُس کی آنکھ کھُلی تو اُجالا پھیل چکا تھا، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے اور نم آلود بادل فضا میں تیر رہے تھے -

—— ارے! رات میں بارش ہوگئی، اللہ میاں کو زمین والوں پر رحم آگیا —— آفتاب نے پلنگ سے اُٹھتے ہوئے کہا اور وہ صحن میں ٹہلنے لگا - اُس نے بھیگی زمین کو اپنے بوٹ کی ایڑی سے دبایا اور بادلوں کی طرف دیکھ کر بولا -

—— واہ جناب! نام بڑے اور درشن تھوڑے! بارش بھی ہوئی تو اتنی کم کہ تشنہ لب زمین کی پیاس بھی نہیں بجھی، سوکھی گھاس میں چند چھینٹوں سے کیا جان آئے گی - - - اور - - - - - - - -

آفتاب میاں کو گُڈ مارننگ —— ایک آواز آئی " آفتاب وہ دیکھو

کی طرف دیکھنے لگا،

—— ارے تم ہو سرفراز —— آؤ آؤ —— ! —— آفتاب سرفراز کی

طرف بڑھتے ہوئے بولا:-

بھئی! آج ہرن کے شکار کے لئے چلیں گے، میں اسی لئے تمہارے

پاس آیا ہوں —— سرفراز نے کہا اور اس پر آفتاب قہقہہ لگا کر بولا:-

—— میاں! شکار کے معاملے میں تم بڑے سبز قدم واقع ہوئے ہو، تمہارے

ساتھ جب بھی شکار میں جانا ہوا خالی ہاتھ لوٹنا پڑا، اور میں کہتا ہوں تمہیں شکار

میں آخر لطف کیا آتا ہے جبکہ تم گولی نہیں چلاتے، فیر نہیں کرتے، زخمی شکار

ذبح کرنے سے جی چراتے ہو۔ تمہارا شمار تو انہیں لوگوں میں ہو سکتا ہے جو شکار

کھیلنے والوں کے ساتھ مارے مارے پھرتے ہیں۔

دونوں دوستوں میں بہت دیر تک مذاق ہوتا رہا۔ اتنے میں ماما نے

اندر سے آ کر کہا کہ ناشتہ تیار ہے، آفتاب نے سرفراز کی طرف مستفسرانہ

نگاہوں سے دیکھا، سرفراز جھٹ سے بول اٹھا، ارے بھئی! نکی اور پوچھ

پوچھ، ناشتہ میں ضرور کروں گا، تمہارے یہاں کی چائے پی کر تو گھنٹوں سرور

سا رہتا ہے۔ ماما! بھابی جان سے کہنا کہ سرفراز آیا ہوا ہے۔ ناشتہ کے

ساتھ تھوڑی سی بالائی اور سرکہ کا اچار ضرور بھیجیں۔

سرفراز اور آفتاب نے مل جل کر ناشتہ کیا اور جنگل جانے کی تیاری

ہونے لگی، آفتاب نے خاکی برجس پہنتے ہوئے سرفراز سے کہا:-

—— بھیّا! تم بہت باتونی ہو، شکار میں باتیں کیں تو آیا ہوا شکار

نکل جائے گا، ہرن کے کھُردں کے کھوج دکھائی دیتے ہی کچھ کہنا ہو تو اشارو ں سے کہنا۔ ہرن بہت چوکنا ہو کر کھیتوں میں بیٹھتے ہیں کہ ذرا پتہ کھڑ کا اور وہ چوکڑی بھرنے لگے۔

سرفراز نے جواب دیا، آفتاب! تم نے مجھے پاگل کیوں سمجھ رکھا ہے، آپ سے ذرا اشارہ لگا نا کیا آگیا کہ تمام دنیا کو اناڑی اور بیوقوف سمجھنے لگے۔ آفتاب دوست کے جواب پر مسکرا کر رہ گیا، تھوڑی دور جانے کے بعد سرفراز نے آفتاب سے دریافت کیا۔

—— چاقو لینا تو نہیں بھول گئے آفتاب!

آفتاب نے اس پر جھنجلا کر کہا:۔

—— سرفراز! میں تم سے ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ شکار کو جاتے وقت چاقو کا نام نہ لیا کرو۔ میرا بارہا کا تجربہ ہے کہ جب کبھی شکار میں کسی نے 'چاقو' کا ذکر کیا تو شکار نہیں ملا۔ شکار میں چاقو کا نام لینا بہت بڑی بدشگونی اور بُری فال ہے۔

سرفراز نے کان پکڑتے ہوئے کہا بھیّا! غلطی ہوئی معاف کردو۔ اب اُس چیز کا نام یوں تو بند وق کے کُندے سے میری خبر لینا ——

—— دونوں دوست بستی سے باہر آ کر پکی سڑک کے چوراستے پر کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک خالی یکّہ دکھائی دیا، آفتاب نے ہاتھ کے اشارے سے یکّہ کو روکا اور کرایہ چُکائے بغیر دونوں اُس میں بیٹھ گئے۔

—— کہاں جائیں گے، ہجور؟ —— یکّہ والے نے دریافت
کیا۔
—— نہر والے باغ تک —— آفتاب نے سگرٹ سُلگاتے
ہوئے جواب دیا اور یکّہ والے نے گھوڑے کو ٹہوکا دے کر ٹھہری ہوئے
یکّہ کو چلا دیا۔ پکّی سڑک جگہ جگہ ٹوٹ گئی تھی، بار بار ہچکولے لگتے تھے۔
سڑک کے دونوں طرف کی گیلی زمین بار برداری کی گاڑیوں کے پہیّوں
کے گہرے گہرے نشانوں سے اور خراب ہو گئی تھی، آفتاب اور سرفراز
گیند کی طرح اُچھلتے ہوئے یکّہ میں جا رہے تھے۔ یکّہ کا گھوڑا کافی تیز اور تنومند
تھا مگر ناہموار راستہ میں سمندِ باد پا بھی اپنے جوہر نہیں دکھا سکتا، اور
اچھے اچھے تیز رفتار گھوڑوں کو خچر کی چال اختیار کرنی پڑتی ہے۔ مُشکلیں،
رُکاوٹیں، نشیب و فراز اور موڑ، حشر خرامی کے زور کو بھی کم کر دیتے ہیں۔
چھ میل کی مسافت میں ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا، نہر کے باغ پر آفتاب اور
سرفراز یکّہ سے اُتر پڑے۔ آفتاب نے یکّہ والے کو چونّی دی اور دوسری
جیب کو ٹٹولنے لگا، یکّہ والا اس پر بولا:۔
—— سرکار! چار آنے کرایہ! سات میل کا! اور وہ بھی پُورے
یکّہ میں یہاں تک آئے ہیں ہجور!
آفتاب نے جیب سے اٹھنّی نکالتے ہوئے جواب دیا:۔
—— یہ لو آٹھ آنے اور لو۔ تم اتنے بے صبر کیوں ہوئے جاتے ہو۔
یکّہ والے نے خوش ہو کر سلام کیا اور کرایہ کی رقم انٹی میں باندھتے ہوئے

بولا :-

—— حضور! شکار سے کب لوٹیں گے؟ آپ حکم دیں تو میں یکّہ لے کر آجاؤں -

آفتاب نے جواب دیا :-

—— ارے بھئی! فقیر اور شکاری کا کیا ٹھیک ہے، جدھر منُھ اُٹھا نکل گئے، شکار مل گیا تو ہم ابھی واپس آجائیں گے اور خدانخواستہ بہت زیادہ دوڑ دھوپ کرنی پڑی تو ممکن ہے دن چھُپے تک ہمارا آنا نہ ہو سکے -

یکّہ والے نے قمیض کی جیب سے بیڑی نکال کر دیا سلائی سے سُلگائی اور آفتاب اور سرفراز کھیتوں کی طرف روانہ ہوگئے - تھوڑی دُور چل کر ہرنوں کے کھُروں کے نشان دکھائی دیئے - سرفراز نے آفتاب کو اشارہ کر کے متوجّہ کیا، آفتاب مسکرا کر بولا :-

ارے میاں! تیس مارتے خاں صاحب! یہ ہرنوں کے پیروں کے باسی نشان ہیں - رات بارش ہو چکی ہے صبح کے وقت جو بھی ہرن کھیتوں سے گزرے گا اُس کے کھُروں کے نشان بہت اُبھرے ہوئے ہوں گے، تازہ کھوج نظر آئیں تو مجھے بتانا، باسی کھوج تو تم کو جگہ جگہ نظر آئیں گے -

آفتاب اور سرفراز کئی میل تک جنگل میں نکل گئے، دونوں کی آنکھیں ہرنوں کو ڈھونڈھ رہی تھیں - ایک کھیت میں سرفراز کو ایک جانور

بیٹھا دکھائی دیا، سرفراز نے خوش ہو کر آفتاب کو اشارہ کیا، آفتاب بندوق سنبھال کر کھیت میں گھسا اور ۲ چار قدم جا کر قہقہہ لگاتے ہوئے

بولا! ——

—— واہ میاں سرفراز! واللہ کیا تیز نگاہ پائی ہے تم نے! ارے بھائی! یہ ہرن نہیں ہے گیدڑ ہے گیدڑ! تم کہو تو لاؤ اسی کو مار کر ڈھیر کر دوں انگریز عورتیں لومڑی کی کھال پہنتی ہیں تم بھابی جان کو گیدڑ کی کھال کا کوٹ بنوا دینا۔ لومڑی اور گیدڑ کی نسل تو ایک ہی ہوتی ہے۔

سرفراز خفّت آمیز ہنسی ہنسنے لگا۔ دوپہر کے بہت بعد تک دونوں کھیتوں میں چکّر لگاتے رہے۔ ایک جگہ بہت دُور ہرن نظر آئے تو وہ اُن کو دیکھتے ہی ہوا ہو گئے۔ بھاگتے ہوئے شکار کو دیکھ کر شکاری جھنجلا جاتا ہے۔ آفتاب شکار نہ ملنے کی جھنجلاہٹ سرفراز پر اُتارنے لگا! اُس نے کہا:۔

—— سرفراز! تم بڑے منحوس واقع ہوئے ہو! اب تک ایک بار بھی گولی چلانی نصیب نہیں ہوئی، آٹھ دن پہلے میں اور حمیدؔ اسی جنگل میں شکار کے لئے آئے تھے، ڈیڑھ دو گھنٹہ کی کوشش میں دو ہرن مل گئے تین چار میل سے زیادہ دُور جانا نہیں پڑا! اور آج جنگل کی خاک چھانتے چھانتے پانچ گھنٹے ہو گئے مگر۔ - - - - - - -

سرفراز نے آفتاب کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا:۔

—— تو چلو گھر لوٹ چلیں! اب تم کل صبح کسی خوش قسمت اور نصیبہ ور ساتھی کو لے کر آنا۔ -

آفتاب نے کہا تم شکاری کی اسپرٹ (Spirit) سے واقف نہیں ہو، شکاری کو آخر وقت تک مایوس نہیں ہونا چاہئے اُسے پچاس میل تک کیوں نہ بھاگ دوڑ کرنی پڑے۔ ابھی تو شام ہونے میں کئی گھنٹے باقی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو شکار مل کر رہے گا۔

—— مگر مجھے تو بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے —— سرفراز نے کہا۔

اُس کا بھی انتظام کر دیا جائے گا۔ سامنے والے گاؤں تک تو پہنچنے دو —— آفتاب جواب دیتے ہوئے کھیتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ پانچ چھ منٹ جانے کے بعد ایک گاؤں والا گھاس کھودتا ہوا ملا، وہ ان دونوں کو دیکھ کر گھبرا سا گیا، لمبے چوڑے خوش صورت جوان، شکاری لباس، بندوق، کارتوسوں کی پیٹی، ایک کسان کی وحشت اور خوف کے لئے تمام اسباب موجود تھے۔

—— ارے بھئی! اس جنگل میں ہرن کدھر مل سکیں گے؟ ہمیں تو کوئی ہرن ورن دکھائی نہیں دیا —— آفتاب نے گاؤں والے سے پوچھا۔

—— حجور! ہمارا یہ جنگل تو ہرنوں کی کھان (کان) تھا، بھیڑ بکریوں کی طرح کھیتوں میں ہرن چگتے پھرتے تھے، مگر جب سے فوج نے یہاں آکر پڑاؤ کیا ہرنوں کا بیج ناس ہو گیا۔ کئی کئی دن تک ہرن کا بچّہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ یہ جو آپ کو آم کے پیڑ نجر (نظر) آرہے ہیں۔ ان سے ڈیڑھ

دو کوس پر ایکھ کے کھیت ہیں وہاں ہرن آپ کو مل جائیں گے۔ پر بھور! گولی دیکھ بھال کر چلانا، کھیت کھیت میں آج کل گھسیارے ہوتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی آدمی کے گولی لگ جائے، ایک مہینہ پہلے ایک جاٹ کی بندوق سے ہمارے گاؤں کا ایک لڑکا گھائل ہو گیا اور معاملہ پولیس تک پہنچ گیا۔

آفتاب نے گھسیارے کی بتائی ہوئی سمت کا رُخ کیا اسا پر سرفراز اُس کا راستہ روک کر بولا، بھیّا! میں تو بھوک کے مارے مرا جاتا ہوں۔۔ خدا کی قسم دو قدم چلنا دوبھر ہے۔ چلو گاؤں میں چلیں کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز مل جائے گی۔

—— بڑے بیٹو ہو تم سرفراز! آخر میں نے بھی تو تمہارے ہی ساتھ ناشتہ کیا تھا —— آفتاب نے کہا۔

—— تم پر تو بھیّا! شکار کا بھوت سوار ہے، تمہارا دل تو ہرنوں میں بڑا ہے، رائفل اور کارتوسوں کی گرمی نے تمہاری بھوک اُڑا دی ہے۔ مگر مجھ غریب کا تو فشار نکلا جاتا ہے —— سرفراز کے جواب پر آفتاب نے ہنستے ہوئے گاؤں کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ تھوڑی سی دیر میں گاؤں آ گیا۔

ہندوستان کا گاؤں —— مٹی اور پھونس کی تباہ شدہ چھاؤنی، ناہموار، تنگ اور غلیظ گلیاں۔ افلاس کا گورِ غریباں، جہالت کا مرگھٹ، مفلسی کی چتا، نادانوں اور بے خبروں کی بستی۔ افلاس زدہ مسرت، فاقوں کی ماری ہوئی خوشی، پھٹے کپڑے، ننگے پاؤں، پیلی بھنیلی

ـــــــــ انسان ـــــــــ کی سانسوں کی فضا میں جلنے والے
دانہ دانہ کو محتاج، قلزم بہ جام لیکن تشنہ لب، خورشید بکف مگر اُجالے
سے محروم، ہندوستان کی قسمت کے مالک مگر بدنصیب، پامال بچپن،
کُچلی ہوئی جوانی، اور زندہ در گور بڑھاپا ـــ مغموم دوشیزگی، عشرتِ نادیدہ
شباب اور بیوگی زدہ سُہاگ!

اس گاؤں میں مشکل سے چالیس پچاس گھر ہوں گے، بچوں، مٹی،
اور کچی اینٹیں بس۔ یہی لے دے کے گاؤں کی کائنات تھی، ایک چوپال
جس کے بارے میں کہا گیا کہ یہ گاؤں کے مکھیا کی بیٹھک ہے اُس کے در پکی
اینٹوں کے بنے ہوئے تھے اور سہ دری میں موٹے موٹے پاؤں اور کھردرے
تختوں کی ایک چوکی بچھی تھی۔ یہ چوپال اس گاؤں کا سب سے اچھا مکان
تھا۔ پولیس کے سپاہی، تحصیل کے چپراسی، نہر کے بیلدار یہیں ٹھہرتے تھے۔
دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ یہ چوپال اس گاؤں کا ڈاک بنگلہ اور ریسٹ
ہاؤس (Rest - House) تھی۔

چوپال کے سامنے مٹی کا ایک چبوترا تھا اور چبوترے کے پاس ہی پیپل
کا تناور درخت تھا، پیپل کے تنہ پر سوت کے کچے دھاگے لپٹے تھے اور گیرو
کی سُرخ دھاریاں بنی تھیں، گاؤں والے اس درخت کو پُوجتے تھے۔ اس پیڑ
کی ایک ڈالی بھی کسی گاؤں والے نے آج تک تراشی نہ تھی۔ کوئی عقیدت مند
اور پُجاری اپنے معبود اور بھگوان کے بدن اور مجسمہ کی تراش خراش برداشت
نہیں کر سکتا۔ ہاں! یہ ضرور تھا کہ موسموں کی شدّت نے ڈالیوں کو خشک

کرد یا یا آندھیوں کے زور سے شاخیں ٹوٹ کر گر گئیں اور حوادث آسمانی کو بھیشن مہاراج روک نہیں سکتے۔

اس جگہ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک دوکان تھی جس میں ہنڈی کی چند ہانڈیاں اور دو چار ٹوکرے رکھے تھے۔ سرفراز کے پوچھنے پر کہ تمہارے یہاں کھانے کی کیا کیا چیز ہے، دُکاندار ترازو کی ڈنڈی چھوتے ہوئے بولا:۔

—— حضور! ایشور کی کرپا اور آپ بھاگوانوں کی دعا سے سب کچھ موجود ہے۔ مُرمُروں کے لڈو، گُڑ کے سیو، مونگ پھلی، بھُنے ہوئے چنے، پرمل، نمکین دال —— اور ہاں سرکار! تیل کی جلیبیاں بھی کل تک تھیں۔ رات کو ایک برات گاؤں میں آکر ٹھہری ساری جلیبیاں اُس نے مول لے لیں، جس چیز کے لئے حضور حکم دیں جو کہو (تول) دوں۔

آفتاب نے سرفراز کی طرف دیکھا اور سرفراز کے اشارہ کرنے پر دُکاندار نے پہلے گُڑ چنے تول کر دیئے، پھر مونگ پھلیاں اور اُس کے بعد نمکین دال! دونوں بھوکے تھے، جوانی میں لوں بھی پیٹ کا دوزخ "ہل من مزید" کی صدائیں لگاتا ہے۔ یہ تو صبح سے ناشتہ کرنے کے بعد کئی میل مسلسل پیدل چلے تھے، کوئی بوڑھا اور معدے کا مریض بھی اتنی دُور چلتا تو بھوک لگ آتی۔ رُومال میں لیتے لیتے دونوں چنے پھانک گئے۔ گُڑ کی ڈھلیاں چٹ کر گئے۔ مونگ پھلیاں جلد جلد چھیل کر چبالیں اور آخر میں نمکین دال کھاتے ہیں پانی مانگا۔ دُکاندار کنوئیں سے تازہ پانی بھر کر لایا اور دونوں نے اوک سے خوب ڈٹ کر پانی پیا۔

——کوئی اور چیز——سرفراز! ——آفتاب نے رومال سے منھ پونچھتے ہوئے کہا۔

——اب کچھ نہیں چاہیے! بس ذرا لیٹنے کو دل چاہتا ہے،

——سرفراز نے آہستگی کے ساتھ جواب دیا۔

——سرفراز! تین بجنے والے ہیں (کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے، شام سے پہلے پہلے گھر واپس ہونا ہے اور ابھی ایک چڑیا تک نہیں ملی، گھسیارے کی بتائی ہوئی سمت میں ہرنوں کی تلاش ضروری ہے، آرام کرنے کے لئے اب ذرا سا وقت بھی ہمارے پاس نہیں ہے اور رہا! تمہارے آرام کرنے اور ستانے سے میں اچھی طرح واقف ہوں تم لیٹ گئے تو بس شام کردو گے۔ ارے میاں! شکاری لوگ اور سپاہی آدمی آرام نہیں کیا کرتے، چھوئی موئی نہ بنو سرفراز! جوان آدمی کو ایسی پست ہمتی کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں——آفتاب جواب دیتے ہوئے بس چل ہی تو دیا!

سرفراز کو بہرحال اپنے بندوقچی اور شکاری دوست کا ساتھ دینا تھا، وہ بھی اُس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوگیا۔ آم کے پیڑوں سے آگے ایکھ کے خوب گھنے کھیت تھے۔ وہ دونوں کھیتوں کے آس پاس ہرنوں کے کھوج ڈھونڈھتے رہے۔ ایک کھیت میں ہرن کے کھروں کے بالکل تازہ نشان نظر آئے، آفتاب کے چہرے پر مسرت کی سُرخی دوڑ گئی اور اُس کی آنکھوں کی پلکوں پر امید جھولنا جھولنے لگی۔ زمین کے اس حصہ میں دور تک بس یہی ایک ایکھ کا کھیت تھا، باقی کھیتوں میں گھاس اُگی تھی یا دوسری فصل کھڑی تھی،

آفتاب نے کھیتوں کے چاروں طرف چکّر لگا کر دیکھا کہ ہرن کھیت ہی میں ہے یا یہاں سے باہر تو نہیں چلا گیا۔ کھیت کے مشرقی حصّہ میں کھیت سے باہر جانے والے ہرن کے کھوج دکھائی دیئے۔ اور وہ دونوں غزالِ صحرا کے نقوشِ پا کو دیکھتے ہوئے چل پڑے۔

جن جنگلوں میں شکاری آتے رہتے ہیں وہاں کے ہرن بہت ہی ہوشیار اور چوکنے ہو جاتے ہیں۔ آدمی کی پرچھائیں دیکھی اور ذرا سی پہچل سُنی۔ بس پھر کیا ہے قلانچیں مارتے ہوئے یہ جا وہ جا! رم خوردہ ہرن ایک ایک میل پر جا کر دم لیتا ہے۔ اس علاقہ میں فوجیوں کی بندوقوں نے جانوروں کو خوف زدہ کر دیا تھا اور ہرن ایک جگہ تھوڑی دیر بھی جم کر نہ بیٹھتے تھے۔ تھوڑی دیر آرام کی خاطر جانور بھی اپنی غرض یہ جانوں کو خطرے میں نہیں ڈالتے ـــــ آفتاب اور سرفراز بہت دُور ہرن کے کھوج کے پیچھے چلے گئے۔ شوق آدمی کو کشاں کشاں لے جاتا ہے، کوئی ان دونوں کو سو سو روپے دے کر کہتا کہ جنگل میں دس میل چکّر لگا کر چلے آؤ تو شاید یہ لوگ حامی نہ بھرتے، مگر یہ اُن کا ذاتی شوق تھا اور شوق کے پیچھے آدمی پتھر کاٹ کر نہر نکال دیتا ہے۔ دل کی لگن پُر شور طوفانوں اور بھڑکتے آتش کدوں سے آدمی کو گزار دیتی ہے۔

یہ تو پھر کھیت، گھاس کی زمین اور پودوں کا جنگل تھا کئی میل جا کر ہرن ایک کھیت میں بیٹھا ہوا ملا۔ ہرن کے آس پاس گھنے پودے تھے اُس کا جسم نظر نہ آتا تھا۔ آفتاب نے نہایت آہستگی سے پودوں کو چیر کر ہٹایا اور بندوق کی سیدھ لے کر گولی چلا دی، ہرن بھاگ کھڑا ہوا، دونوں دوست

کھیت کے باہر بھاگ کر پہنچے، ہرن کے کھوج کے آس پاس لہو کے نشان تھے
— سرفراز! ہرن زخمی ہو گیا اب ہمیں تیزی کے ساتھ اُس کا پیچھا
کرنا ہے، وہ زیادہ دُور نہیں جا سکتا، دو چار کھیت جانے کے بعد ٹھنڈا
ہو جائے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے پہنچتے پہنچتے وہ ختم ہو جائے اور ہم اُسے
ذبح بھی نہ کر سکیں، بھائی! خدا کے لئے تیز قدم اُٹھاؤ، بس اب کوئی دم
میں دن بھر کی محنت وصول ہوئی جاتی ہے۔ میرے پیچھے چلے آؤ —
— آفتاب کہتا جاتا تھا اور دوڑتا جاتا تھا، تازہ گھاؤ میں زخمی
ہرن بہت دور تک بھاگا چلا گیا، لہو کے ہر بھاٹے کو دیکھ کر آفتاب سمجھتا
تھا کہ بس اب ہرن زمین پر لوٹتا ملے گا۔ مگر زندگی سب کو پیاری ہوتی ہی
ذرا سی چیونٹی بھی زندگی کی رمق باقی رہنے تک نچلی نہیں بیٹھتی، یہ تو پھر
ہرن تھا جس کی تیزیٔ رفتار پر ہَوا کی موجوں کو رشک آتا ہے۔

شام ہو چلی تھی، پرندے اپنے گھونسلوں میں بسیرے کے لئے جا چکے
تھے۔ ایک آدھ پرند جس کا گھونسلا کسی گاؤں کے نٹ کھٹ لڑکے نے
نوچ کر برباد کر دیا تھا، یا وہ بہت دور نکل کر اپنے آشیانے کا راستہ
بھول چکا تھا اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ گھٹاؤں نے وقت سے
پہلے رات کے آثار پیدا کر دیئے تھے۔ ہرن کے پیروں کے نشان اور
لہو کی سُرخی بھی اندھیرے میں دکھائی نہ دیتی تھی، پختہ کنوئیں کے پاس
پہنچکر دونوں رُک گئے۔

ہم کہاں نکل آئے، آفتاب! پختہ سڑک یہاں سے کتنی دُور

ہو گی، رات میں تو سواری بھی مشکل ہی سے مل سکے گی؟ ——— سرفراز نے تیز تیز سانس لیتے ہوئے کہا۔

——— سرفراز! تم نے ایک سانس میں ایک درجن سوال کر دیئے! اتنے گھبراتے کیوں ہو، یہاں سے ڈیڑھ ڈھائی میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے۔ رات میں وہاں ٹھہر جائیں گے۔ میں نے تو شکار کے پیچھے بہت سی راتیں دیہات میں بسر کی ہیں، گاؤں کے لوگ بڑی تواضع سے پیش آتے ہیں۔ شہریوں کے یہاں تو تم نے بہت سی ضیافتیں اڑائی ہیں آج رات کو دیہاتیوں کی سادہ میزبانی کا بھی رنگ دیکھ لینا ——— آفتاب نے بندوق کی نال کو زمین پر گاڑتے ہوئے جواب دیا۔

——— آفتاب! نہ جانے کیوں میرا دل بیٹھا سا جا رہا ہے ——— سرفراز نے ہانپتے ہوئے کہا۔

——— صاف کیوں نہیں کہتے کہ ڈر لگ رہا ہے، اوسان خطا ہوئے جا رہے ہیں ——— آفتاب بولا۔

——— میں بزدل اور کم ہمت نہیں ہوں آفتاب! مگر آج خدا معلوم کیوں میرا دل اوپر نیچے ہو رہا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس اندھیرے کے پیچھے کوئی زبردست خطرہ ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ اتنی ڈراؤنی رات اور اس قدر بھیانک منظر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ خطرے کے اندیشوں نے میرے دل ہی کو نہیں میرے پیروں کو بھی بوجھل بنا دیا ہے ——— سرفراز نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر جواب دیا۔

——— سرفراز! تمہارے منہ سے ایسی بزدلی کی باتیں زیب نہیں دیتیں!
ارے بھئی! یہ کوئی شیروں کا کچھار ہے، ڈاکوؤں کا جنگل ہے، بھوتوں کا مسان ہے جو تم خوف کے مارے نڈھال ہوئے جا رہے ہو، اور پھر تم اکیلے نہیں ہو، میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ دونالی کی بندوق اور کارتوسوں کی پیٹی میرے پاس ہے کوئی بات آن پڑی تو تمہارے سر عزیز کی قسم دھوئیں اُڑا دوں گا ——— خدا کے لئے دل کو مضبوط کرو۔ ۔ ۔ اور ہاں! سرفراز! وہ کل تم کس شاعر کی غزل گنگنا رہے تھے ۔جس کا ایک مصرع غالباً یہ تھا۔

ے آؤ ہر خار بیاباں کو گلستاں کر دیں

ذرا اس غزل کے شعر تو سناؤ ——— آفتاب نے گاؤں کی طرف واپس ہوتے ہوئے کہا۔

مجھے اُس غزل کا ایک مصرع بھی اس وقت یاد نہیں آرہا ہے، میرا حافظہ آج کچھ کھو سا گیا ہے۔ جیسے کسی نے تمام یاد کی ہوئی باتوں کو ذہن سے چھین لیا۔

——— سرفراز نے جواب دیا اور آفتاب جھنجھلا کر چپ ہو گیا ———

برسات کی اندھیری رات، کالی گھٹائیں، ایکھ کے کھیت، جنگل کا سناٹا، کھیتوں کی مینڈھوں کے نشیب و فراز اور اُس پر ایک خوف زدہ دل ——— سرفراز کو قدم قدم پر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب کوئی ہاتھ نمودار ہوا۔ اور اُسے دبوچ لیا۔ ایکھ کے پودے اُسے سیاہ دیو نظر آتے تھے خوف اور دہشت نے اُس کے پیروں کو من من بھر کا کر دیا تھا۔ ہوا سے پودے ہلتے تو وہ سہم کر جسم سمیٹنے لگتا جیسے کوئی اُس کی طرف حملہ کرنے کے لئے آرہا

ہے۔ اُس کا ماتھا پسینہ میں ڈوب گیا تھا اور ہونٹوں پر خشکی کے مارے پپڑی جم گئی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کی رگوں میں خون کی گردش بند ہو گئی ہے اور شدّتِ خوف کا یہی عالم رہا تو وہ شاید بے قابو ہو کر زمین پر گر جائے گا۔ آفتاب کو سرفرازہ کی اس بُزدلی پر جھنجلاہٹ آ رہی تھی۔ اُس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو سرفرازہ کو ہزاروں ملّاحیاں سُناتا اور اُس کی کم ہمتی کا طرح طرح سے مذاق اُڑاتا۔ آفتاب بہت سمجھدار تھا اُس نے سوچا کہ نصیحت، غصّہ اور طنز و تشنیع سے اور معاملہ بگڑ جائے گا۔ ڈرا ہوا آدمی طنز اور غصّہ سے اور ہمّت ہار جاتا ہے۔ نفسیات کی ان باریکیوں کو ذہن میں رکھ کر آفتاب نے سرفراز کا خیال بٹانے، ہمّت بندھانے اور سکوت توڑنے کے لئے بات چیت شروع کی ——— اُن کی باتیں:——

——سلطانہ رضیہ اور جھانسی کی رانی نے گھمسان لڑائیوں میں فوجوں کی کمان کی —— ہندوستان نے بھی کیسی کیسی بہادر عورتوں کو پیدا کیا ہے!

——— اس خوفناک سنّاٹے میں لڑائیوں کا ذکر نہ نکالو —— آفتاب!

——(موضوع بدل کر) تمہارے والد کلکٹر صاحب سے ملنے کے لئے گئے تھے۔ کیا گُفتگو رہی؟

——— وہ کچھ خوش نہیں آئے۔ ان فوجی قسم کے افسروں سے آدمی کو ڈرتے رہنا چاہئے۔

——— سُنا ہے کہ تمہاری ملازمت کا مسئلہ اس مہینہ میں ضرور طے ہو جائیگا۔
یار، پیشگی مٹھائی کھلاؤ!
——— اس خوفناک ماحول سے بچکر گھر صحیح سلامت پہنچ گیا۔ تو (آفتاب بیچ
میں بول پڑا)
——— ارے میاں! میں نے کئی مرتبہ تمہارا ہاتھ دیکھا ہے، پامسٹری میں اس
نیازمند کو تھوڑا بہت دخل ہے، ایک سو سال کے لگ بھگ ہے۔ تمہاری عمر۔ اور
خطروں سے تو تمہاری زندگی بالکل محفوظ ہے۔ بہت سے بہت دو چار بیماریاں تم کو ہونگی۔
اور بس راوی چین ہی چین لکھتا ہے ——— (گیدڑوں کی آوازیں آنے لگیں ---
سرفراز کے بدن میں گیدڑوں کی آواز سے تھرتھری پیدا ہو گئی، وہ آفتاب سے
چمٹ کر چلنے لگا، اُس کی سانسوں کی تیزی بڑھ گئی، آفتاب نے اس پر عتاب آمیز ہنسی کو
روکتے ہوئے کہا:۔
——— سرفراز اسُنا، یہ مکار گیدڑ اپنا دکھڑا رو رہے ہیں۔ کہ ہم مظلوم ہیں،
بیکس ہیں، بھوکوں مرے جاتے ہیں، ہمیں پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا، بستی میں ہمیں کوئی
گھُسنے نہیں دیتا اور جنگل کے جانور ہمیں ذلیل سمجھتے ہیں، ہم سے تو کُتّے ہی اچھے ہیں کہ
دو چار ڈنڈے اور دس بیس پتھر کھا کر انہیں روٹی تو مل جاتی ہے۔ سرفراز! تم ان
ذلیل اور بزدل جانوروں سے کہہ دو کہ دُنیا میں بُزدلوں اور مکّاروں کو عزت کا کوئی مقام مل
ہی نہیں سکتا۔ عزت کے سزاوار سچے، بہادر، اور پرہیزگار لوگ ہیں۔ ارے صاحب!
بُزدلی کی انتہا ہے گاؤں کا دس برس کا لڑکا سو گیدڑوں کو بھگا سکتا ہے۔ آدمی کی پہلی اور
پرچھائیں سے گیدڑ تھرتھرانے لگتے ہیں ———

دونوں دوست آم کے ایک باغ میں پہنچ چکے تھے، گھنے پیڑوں نے رات کے اندھیرے کو اور زیادہ تاریک اور بھیانک بنا دیا تھا۔ باغ کے ایک گوشہ میں پختہ دھرم شالہ اور کنواں تھا، اُس طرف بہت ہی ہلکی سی روشنی کبھی کبھی دکھائی دیتی تھی جیسے جگنو چمک رہے ہوں یا کوئی دیا سلائی جلا کر بجھا دیتا ہو۔ آفتاب اور سرفراز باغ کے وسط میں تھے کہ ایک گرجتی ہوئی للکار نے :۔

—— ٹھہر جاؤ! ایک قدم بھی بڑھایا تو گولی مار دی جائے گی"

دونوں کو ٹھہرنے پر مجبور کر دیا۔ آفتاب کے ہاتھ میں بھری ہوئی بندوق تھی اُس نے بندوق سنبھالی تو سرفراز بُری طرح اُس سے چمٹ گیا کہ غریب کے دونوں ہاتھ بندھ گئے، اور اتنے میں ڈاکوؤں نے اُنہیں آکر گھیر لیا۔ سرفراز کی گھگھی بندھ گئی تھی اور اُس کا بدن بید کی ڈالی کی طرح کانپ رہا تھا۔ آفتاب بھی ڈاکوؤں کو دیکھ کر سہم گیا۔ مگر اُس کے حواس بجا تھے اور وہ بوکھلاہٹ سے خطرے کو اور زیادہ سنگین بنا دینا نہیں چاہتا تھا۔

—— یہ تو پولیس کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کو یہیں ڈھیر کر دو ——

ایک ڈاکو نے ٹارچ روشن کرتے ہوئے کہا۔

—— ہم تو شکاری ہیں، پولیس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے —— آفتاب نے جواب دیا۔

—— بندوق اور کارتوس میرے حوالے کرو —— ...... دوسرا ڈاکو آگے بڑھ کر بولا —

—— لیجئے —— یہ لیجئے ...... آفتاب نے جواب دیتے ہوئے بندوق اور کارتوس ڈاکو کو پکڑا دیئے۔

ڈاکوؤں نے دونوں کی جامہ تلاشی لی کہ کہیں کوئی پستول اور طمنچہ تو اُن کے پاس نہیں ہے۔ آفتاب کی جیب میں شکاری چاقو تھا وہ بھی لے لیا گیا۔ اب وہ دونوں ڈاکوؤں کی حراست میں تھے۔ سرفراز تو پہلے ہی سے ڈرا ہوا تھا مگر اس ماحول میں آفتاب کی جرأت مردانہ کو بھی پسینہ آگیا۔ اندھیری رات، سنسان جنگل، دو نہتے آدمی اور مسلح ڈاکوؤں کا نرغہ، بڑے سے بڑا جیوٹ اور بہادر آدمی بھی ہوش و حواس میں اعتدال قائم نہیں رکھ سکتا۔

ڈاکوؤں کے سرغنے اور مشیر کار دوسری سمت جاکر مشورہ کرنے لگے۔ ایک نے کہا کہ ان دونوں کو قتل کر دینا چاہیئے۔ دوسرے ڈاکو نے جواب دیا کہ ان بیچاروں کا آخر قصور کیا ہے۔ بندوق اور کارتوس ہم نے حاصل کر لئے، ہمارا مقصد پورا ہو گیا۔ بس اب ان کو چھوڑ دو۔ تیسرے نے کہا اور اگر انہوں نے یہاں سے جاکر آس پاس کے گاؤں والوں کو ہماری موجودگی کی اطلاع دیدی تو ہمارے سارے منصوبے خاک میں مل جائیں گے ایک بوڑھا ڈاکو بولا کہ ان دونوں کو یہیں باغ میں رسی سے باندھ کر چھوڑ دو۔ اس کے جواب میں ایک نوجوان لٹیرا بول اُٹھا، ان بڑی صاحب کی تو عقل سٹھیا گئی ہے، بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں، ارے صاحب! ہمارے یہاں سے جانے کے بعد انھوں نے چلانا اور شور مچانا شروع کیا تو گاؤں والے ان کی مدد کے لئے ضرور آجائیں گے اور ہماری اسکیم ہی تباہ ہو جائے گی ——— بہت کچھ شور و خوص اور مشورے کے بعد آخر یہ بات طے پائی کہ دونوں آدمیوں کو ڈاکہ میں ساتھ رکھا جائے

یہ لوگ خاکی وردی میں ہمیں جیسے معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح ہماری تعداد بھی بڑھ جائے گی، ڈاکہ کے بعد ان کے بارے میں فیصلہ کیا جائیگا کہ ان کو کہاں کس طرح اور کب چھوڑا جائے اور یہ کس قسم کے سلوک کے مستحق ہیں۔

ڈاکوؤں کا سردار ادھیڑ عمر کا تھا۔ بہت لانبا قد۔ قدرے بھاری بدن کالا رنگ۔ چھوٹی مگر چمکیلی آنکھیں۔ گچھّے دار مونچھیں، اُس کے چہرے سے جلادی اور غارت گری برستی تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر سے سگرٹ سُلگاتا اور دو چار کش لگا کر باقی کی سگرٹ پھینک دیتا۔ اتنی دیر میں دوسرا ڈاکو اپنی جیب سے سگرٹ نکال کر اُس کو پیش کرتا اور وہ پھر دھوئیں اُڑانے لگتا۔ سردار نے آفتاب کا شانہ ہلا کر کہا:۔

"تم دونوں کو ہمارے ساتھ ڈاکہ میں چلنا ہوگا۔ تم سے کوئی کام نہ لیا جائیگا۔ بس تم میرے ساتھ رہنا۔ دیکھنا! گاؤں میں پہنچکر اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی یا تمہاری طرف سے کسی قسم کی شرارت کا اظہار ہوا تو تمہیں گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔ میں ڈاکوؤں کے سردار کی حیثیت سے حکم دے رہا ہوں۔ موت میرے اشارے پہ ناچتی ہے اور خون ریزی ہر وقت میری تیور دل پہ نگاہ رکھتی ہے۔ زندگی پیاری ہے تو میرا حکم ماننا اور اپنے عہد کو نباہ دینا"

اس حکم کے آگے سر اطاعت خم کرنے کے سوا چارہ کار ہی کیا تھا۔ ظلم و ذلیلیں سُنکر اور برا فروختہ ہو جاتا ہے۔ جبر انصاف کے نام سے بھڑک جاتا ہے۔ نیت کی

کھوٹ عدل و دیانت کے ذکر سے آتش زیر پا ہو جاتی ہے۔ سرفراز میں نہ کچھ کہنے کی سکت ہی نہ رہی تھی۔ اب رہا آفتاب سو وہ ڈاکوؤں کے سردار کے حکم کے خلاف چوں و چرا کرتا تو اُسی کی رائفل اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیتی۔ اور کارتوسوں کی وہ پیٹی جو تھوڑی دیر پہلے اُس کی گردن میں حمائل تھی اُس کا کوئی کارتوس آفتاب کے جسم میں گھُس کر موت کے فرشتے کو خوش آمدید کہتا۔

یہ سُنکر کہ اُن دونوں کو ڈاکوؤں کے ساتھ کسی آبادی میں جانا ہوگا سرفراز کی ڈھارس سی بندھ گئی۔ جنگل کا سناٹا ایک تو پہلے ہی سے اُسکے لئے رُوح فرسا اور دہشت انگیز بنا ہوا تھا۔ ڈاکوؤں کے نرغے میں پہنچکر یہ دہشتِ موہوم زندہ اور محسوس حقیقت بن گئی۔ وہ اس تصوّر ہی سے سکون و اطمینان سا محسوس کرتا تھا کہ گاؤں میں پہنچکر ایک مصیبت تو کم سے کم دُور ہو جائے گی۔ اب رہے ڈاکو تو آبادی میں فرار کے موقعے بھی مل سکتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ خاموشی کے ساتھ ڈاکہ نہ ڈالنے دیں گے اور اپنے ہموطن کی لوٹ ٹھنڈے پیٹوں گوارا نہ کریں گے۔ مقابلہ ہوا تو کیا عجب ہے کہ اس ہنگامہ میں فرار کی کوئی صورت نکل آئے۔

آدھی رات کے قریب ڈاکوؤں کی ٹولی آم کے باغ سے گاؤں کی طرف روانہ ہوئی۔ تین اصلی ڈاکو تھے اور دو بناوٹی بلکہ عارضی ڈاکو، جو جان کے خوف سے اور موت کی دھمکی سے ڈاکے میں چلنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ یہ ٹولی بتیس آدمیوں پر مشتمل تھی جن میں سے تیس اس ارادہ سے قدم بڑھا رہے

تھے کہ بندوقیں چھوڑ کر، گولیاں چلا کر، تلواریں دکھا کر اور مکان میں آگ لگا کر دولت لوٹیں گے۔ کسی بدنصیب نے مزاحمت کی تو اُسے گولی کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔ ہم چوروں اور اُٹھائی گیروں کی طرح بزدل اور ڈرپوک نہیں ہیں جو چھپ کر اور آنکھ بچا کر دوسروں کا مال اُڑا لیتے ہیں۔ ہم تو مال والے کو آگاہ کر کے مال لوٹتے ہیں اور یہ دراصل ہماری بہادری اور ہمت مردانہ کا خراج اور ٹیکس ہے۔ ان تینوں کی آنکھوں میں خونخواری غارت گری، لوہے کی تجوریاں، سونے چاندی کی اینٹیں، اور قیمتی زیور جھلک رہے تھے اور سرفراز و آفتاب کی مجبوریاں دل ہی دل میں فریاد کر رہی تھیں کہ یا اللہ، یہ ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ ہم ڈاکوؤں کے ساتھ ڈاکہ ڈالنے کے لئے کشاں کشاں کھینچے جا رہے ہیں؟ ہم آج لٹیروں اور غارت گردی کی اُس بدنام جماعت کے ساتھ ہیں جو سوسائٹی میں سب سے زیادہ ذلیل اور مجرم سمجھی جاتی ہے۔ جس جماعت سے کوئی بُرے سے بُرا آدمی بھی اپنی نسبت گوارا نہیں کر سکتا۔ ہم نے ایسا کیا قصور کیا تھا جس کی ہمیں اتنی سنگین اور عجیب و غریب سزا دی گئی — — بے گناہی اور معصومیت، شرافت اور ذلت، سعادت اور شقاوت، بھلائی اور برائی ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

جس مکان میں ڈاکہ ڈالنے کے لئے یہ ٹولی روانہ ہوئی تھی وہ گاؤں کے بیچ میں واقع تھا۔ ڈاکوؤں نے بنئے کے اس مکان پہنچتے ہی فیر شروع کر دیئے۔ گاؤں میں جاگ ہو گئی۔ گاؤں والے بنئے کی حویلی کی طرف بڑھنے

لگے، ڈاکوؤں نے ہوائی فیر کرتے ہوئے کہا :-

—— پرائی آگ میں نہ پڑو۔ ہماری طرف ایک قدم بھی بڑھایا تو چنے مٹر کی طرح بھون دیئے جاؤ گے۔

بندوقوں کی آواز سُنکر دیہاتی گلی کے نُکڑ پر رُک گئے۔ گاؤں والے بہت بہادر سہی مگر جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ اور طاقت کے بغیر جان پر کھیل جانا بہادری نہیں نادانی ہے۔ بانس کی لاٹھیاں آتشیں ہتھیاروں کا مقابلہ کس طرح کرتیں۔ گاؤں کے لوگ بنیئے کی حویلی سے دُور اِدھر اُدھر کھڑے تھے۔ دو ڈاکو بالاخانہ پر چڑھ کر ٹارچ کی روشنی سے دیکھ رہے تھے کہ دیہاتی کہاں کھڑے ہیں۔ اُن کی نقل وحرکت کا کیا انداز ہے۔ جس سمت کو لوگوں کا زیادہ مجمع ہوتا ڈاکو اُسی سمت کا نام لے کر بندوقچی کو پکارتے :-

" پُروا ہوا زور پر ہے "

اور بندوقچی مشرق کی سمت دَن سے بندوق داغ دیتا۔ بندوق کا فیر سُن کر لوگوں کی بھیڑ چھٹ جاتی اور بڑھتے ہوئے قدم رُک جاتے۔

سرفراز اور آفتاب ڈاکوؤں کے سردار کے حکم کے مطابق اُس کے ساتھ ساتھ تھے۔ سردار چند ڈاکوؤں کو لے کر حویلی کے اندر پہنچا۔ گھر کے لوگ ایک کوٹھری میں چھپ گئے تھے۔ اُن کو پکڑ کر سختی کی گئی کہ مال بتاؤ۔ پہلے پہل تو گھر والوں نے حیل حجت اور ٹال مٹول کی لیکن جب جلتی ہوئی مشعل اُن کی طرف بڑھی تو ایک بڑھیا نے تجوریوں کی کنجیوں کا

گچھا پھینک دیا۔ تجوریاں کھلیں۔ روپیہ، پیسہ اور زیور نکالا گیا۔ اِدھر مال برآمد کیا جا رہا تھا اور اُس طرف گاؤں والوں نے ایکا کرکے ڈاکوؤں پر خشت باری شروع کر دی۔ کوٹھوں کی منڈیروں اور چھپروں کی آڑ میں چھپ چھپ کر اینٹیں برسانے لگے۔ بندوق کا ایک فیر ہوتا تو اینٹیں تنو برس جاتیں، کئی ڈاکو زخمی ہو گئے۔ ایک اینٹ نے بندوقچی کو لہو لہان کر دیا۔ باہر کھڑے ہوئے ڈاکوؤں کے اوسان سے خطا ہو گئے، اینٹوں اور ٹھیکروں کا مینہہ برس رہا تھا۔ ایک طرف صرف تیس آدمی تھے اور دوسری طرف تین سو چار سو آدمیوں کی جمعیت! اور اُن تیسوں میں سے دس بارہ آدمی تو مال لوٹنے اور باندھنے میں مشغول تھے، گھر پہ تو چیونٹی بھی شیر ہوتی ہے۔ حملے کے کامیاب اور بڑھتے ہوئے دباؤ نے دیہاتیوں کی ہمت کو دوبالا کر دیا۔ بڑھے بوڑھے نوجوانوں کو غیرت دلا رہے تھے کہ دیکھنا! گاؤں کی عزت کو بٹہ نہ لگ جائے۔ ڈٹے رہو۔ پیچھے نہ ہٹو بس میدان تمہارے ہاتھ ہے۔ گاؤں کی عورتیں گھڑوں، مٹکوں، اور ٹھلیوں کو توڑ توڑ کر مردوں کو ٹھیکرے دے رہی تھیں۔ لوگوں کی چیخ پکار اور بندوقوں کی آواز سُن کر قریب کے گاؤں کا ایک مُکھیا اپنی بندوق لے کر آ گیا اور اُس نے ڈاکوؤں کے جواب میں جو تابڑ توڑ فیر کئے ہیں تو تین ڈاکو وہیں ڈھیر ہو گئے۔

حویلی کے اندر مال دا اسباب تلاش کرنے کے لئے ڈاکوؤں نے لالٹینیں روشن کر لیں، ڈاکوؤں کا سردار بڑی تجوری کی طرف بڑھا ہی

تھا کہ اُسے تجوری کی آڑ میں ایک خوبصورت لڑکی نظر آئی۔ لڑکی اس دیو صفت ڈاکو کو دیکھ کر سہم گئی۔ اُٹھتی جوانی، قابلِ رشک صحت، موزوں ناک نقشہ، گندمی رنگ۔ سردار لڑکی کو دیکھ کر لڑکھڑا سا گیا۔ تمام حویلی پر آج کی رات اُسی کی حکمرانی تھی۔ گھر کے سیاہ و سپید کا وہی مالک تھا۔ ایک با اختیار ڈاکو سے شرافت اور پاک بازی کی توقع کرنا حماقت ہے۔ جو شخص مال و دولت کے لئے کسی بے گناہ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ سکتا ہے۔ وہ عصمت پر بھی ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ مجرمانہ فطرت موقع سے فائدہ اُٹھانے میں بہت دلیر اور تیز ہوتی ہے۔ آدمی کسی کے مال پر اسی لئے ڈاکہ ڈالتا ہے۔ کہ ڈکیتی کے مال سے خوب گلچھرے اُڑائے اور حظِ نفس کے ممکنہ سامان مہیا کرے۔ اگر نفس قانع، محتاط اور پرہیز گار ہو تو دوسرے کے مال پر دست درازی کی نوبت ہی نہ آئے۔

باہر ڈاکوؤں میں بھگدڑ مچ رہی تھی اور اندر اُن کا سردار بنئیے کی جوان اور خوبصورت لڑکی کی طرف ملتفت تھا۔ سرفراز اور آفتاب سردار کے ساتھ تھے۔ سردار نے لڑکی کو آغوش میں لینے کے لئے اقدام کیا ہی تھا کہ آفتاب نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

—— تم مجھے روک رہے ہو؟ تم ——" سردار نے آفتاب کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بندوق کی نال اُس کی طرف کر دی۔

—— تم میرے سامنے ایک شریف لڑکی کی عصمت پر حملہ نہیں کر سکتے، میں یہ نہ ہونے دوں گا —— آفتاب نے جواب دیتے ہوئے

بندوق پر ہاتھ ڈال دیا، دونوں میں کش مکش ہونے لگی۔ لڑکی دیوار کے سہارے خوف زدہ کھڑی تھی۔ سرفراز نے کچھ ہمت نہ دکھائی تو سردار کی ٹھوکر نے اُس کو سر کے بل گرادیا، باہر سے ایک ڈاکو بھاگا ہوا آیا اور بدحواسانہ انداز میں بولا۔

ـــ سردار! ہمارے تین ساتھی مارے گئے۔ دو زخمی ہیں۔ دوسرے گاؤں کے لوگ بندوقیں لے کر آگئے۔ چلئے، بھاگئے۔ اپنے کو بچایئے ـــ"

ڈاکوؤں کا سردار بہت تنومند تھا مگر ایک شریف لڑکی کے بچانے کے عزم نے آفتاب کو فولادی انسان بنادیا تھا۔ ڈاکو اُسے زیر نہ کرسکا۔ اسی کش مکش میں بندوق چل گئی۔ لڑکی نال کی بالکل زد میں تھی۔ گولی اُس کی ٹانگ میں لگی اور وہ فرش پر تڑپنے لگی۔ سردار بندوق چھوڑ کر بھاگا۔ اتنے میں گاؤں والے مکان میں گھس آئے۔ بنیے کی لڑکی لہو میں نہائی پڑی تھی۔ سرفراز دیوار پکڑے تھر تھر کانپ رہا تھا اور آفتاب بندوق لئے لڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ گاؤں والوں نے اِن دونوں کو گرفتار کرلیا۔

ڈاکو اپنے مقتول ساتھیوں کے سر کاٹ کر بھاگ گئے اور اُن میں سے کوئی بھی گرفتار نہ ہوسکا۔ آخر میں ڈاکوؤں کا سردار اور چند ڈاکو جو رہ گئے تھے انہوں نے یہ چالاکی کی کہ صبح کے جھٹ پٹے میں گاؤں والوں کی طرح شور مچاتے ہوئے کہ۔

"ڈاکوؤں کو پکڑلینا۔ جانے نہ دینا۔ سنبھالنا بھائی ـــ!"

فرار ہوگئے۔

پورے طور پر دھوپ پھیلی بھی نہ تھی کہ تھانیدار مسلح گارڈ کے ساتھ موقعِ واردات پر آ گیا۔ بنیئے کی مجروح لڑکی کو شفا خانے بھجوایا گیا۔ سرفراز اور آفتاب گاؤں والوں کے نرغے میں گردن جھکائے کھڑے تھے، گاؤں والوں کے تنقیدی فقرے اُن کے کان کے پردوں میں شیشے کے نکیلے ٹکڑوں کی طرح چبھ رہے تھے۔ سب لوگ باری باری سے کہہ رہے تھے۔

—— مہاتماؤں جیسی صورت اور کام راکششوں کے!

—— باپ کا مال سمجھ کر پرائے دھن پر ہاتھ ڈالا تھا!

—— کیسے سر جھکائے کھڑے ہیں جیسے یہ بے چارے بڑے بھولے اور نردوشی ہیں۔

—— ارے کھوانی! ذرا ان کی جوتوں سے مرمت تو کر دو۔ یہ بھی یاد کیا کریں گے کہ کسی گاؤں میں ہم نے ڈاکہ ڈالا تھا۔

—— نہ جانے اب تک کتنے گھر لوٹے ہوں گے اور کتنے خون کئے ہوں گے ان جالموں (ظالموں) نے۔

تھانیدار آفتاب اور سرفراز کو گرفتار کر کے تھانے لے گیا اور مجسٹریٹ کے سامنے اُن کو پیش کر دیا گیا۔ سارے علاقے میں اس خوں ریز ڈکیتی کی شہرت ہو گئی۔ وہ ڈاکہ جس میں تین ڈاکو جان سے مارے جائیں۔ گاؤں کے متعدد آدمی زخمی ہوں، ہزاروں کا زیور چلایا جائے۔ دو ڈاکو موقع پر گرفتار ہوں، اُسے سنگین ہونا ہی چاہیئے۔ اور وہ نہ صرف دیہات میں بلکہ شہروں میں شہرت پانے کا مستحق ہے۔

بے سبب کی رُسوائی بہت زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ گناہ کر کے آدمی پکڑا جائے تو ضمیر مطمئن رہتا ہے اور دل کو صبر آجاتا ہے کہ کرنی کا پھل ملگیا مگر ایک بے گناہ جب خواہ نخواہ کسی مُعاملہ میں اُلجھا دیا جاتا ہے اور کوئی تہمت اُس کے سر تھوپ دی جاتی ہے تو اُس کی روحانی تکلیف اور قلبی اذیت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ آفتاب اور سرفراز کو لوگ ڈاکو کہہ کر پکارتے تھے اس سے زیادہ بدنامی اور کیا ہوسکتی تھی، ڈاکو کا نام زبان پر آتے ہی غارت گری، سفاکی، خوں ریزی اور ظلم و شقاوت کے تصورات مجسّم ہو کر نگاہ کے سامنے آجاتے تھے۔

عدالت میں آفتاب اور سرفراز کے ابتدائی بیانوں کو عدالت نے ذرا بھی لائق توجہ نہیں سمجھا۔ وہ دو ڈاکو جو عین موقع واردات پر گرفتار ہوں اور وہ بھی اس حالت میں کہ ایک ڈاکو کے ہاتھ میں بندوق ہو، اُن کا یہ عُذر کہ ہمیں ڈاکو جنگل سے زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے آئے تھے، ہم بالکل بے گناہ ہیں۔ ہم تو ان ڈاکہ ڈالنے والوں میں سے کسی ایک کو بھی نہیں جانتے۔ کسی معمولی عقل والے کے نزدیک بھی قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ مجرموں کا عام قاعدہ ہے کہ وہ اپنی بریت اور بچاؤ کے لئے اسی قسم کے کمزور سہارے تلاش کیا کرتے ہیں۔ عدالتیں واقعات اور ثبوت و شواہد دیکھ کر قیاس قائم کرتی ہیں۔ دلوں کے حال پڑھنے اور باطنی کیفیات کا اندازہ لگانے کے لئے آج تک کوئی آلہ سائنس نے ایجاد نہیں کیا۔

آفتاب اور سرفراز کے گھر والوں نے جان توڑ کر پیروی کی، وہ لوگ

بیچارے، دوسروں کے طعنے اور چبھتے ہوئے فقرے سُن سن کر زمین میں گڑے جاتے تھے۔ اُن دونوں کے باپوں کو دیکھ کر لوگ کہتے کہ یہ آفتاب ڈاکو کے والد ہیں اور وہ سرفراز ڈاکو کے باپ ہیں۔ شہر میں گیا دُور دُور اُن دونوں کے گھرانوں کی رُسوائی اور بدنامی ہو رہی تھی۔ سرفراز اور آفتاب کے گھر والوں نے شہر کی بیاہ شادی کی تقریبوں میں آنا جانا چھوڑ دیا۔ شہر کے لوگ کہتے تھے کہ سرفراز کے باپ نے جو یہ تیس ہزار کی حویلی بنائی ہے اور آفتاب کے والد نے جو اپنی بیٹی کا اتنی دھوم سے بیاہ کیا تھا وہ سب ڈاکہ کی کمائی تھی۔ شہر میں آخر اور بھی تو اسی حیثیت کے آدمی ہیں اُن بے چاروں کو تو اس گرانی کے زمانہ میں اپنی آبرو سنبھالنا دشوار ہو گئی ہے۔ اور ان دونوں گھروں میں رنگ رلیاں ہوتی ہیں، دعوتیں، پارٹیاں، شکار، اچھا کھانا، اچھا پہننا۔ ایک چھوڑ دو دو تین تین نوکر، صوفے، کرسیاں، مسہریاں۔ جھاڑ فانوس، قیمتی برتن، خوشنما قالین ——!

اور صاحب! سو سو روپے تو چندوں میں دیدیئے جاتے ہیں —— آخر یہ روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ بیٹے ڈاکہ مارتے ہیں اور باپ خیرات بانٹتے ہیں۔ کہ ہم بڑے غریبوں کے دردمند، بیواؤں کے غمخوار، یتیموں کے ہمدرد اور قوم کے بہی خواہ ہیں۔ پاپ کے گھڑے کو آخر ایک دن بھرنا تھا۔ سو بھر کر رہا، کاغذ کی ناؤ کب تک چلتی، اور گناہ کب تک چھپے رہتے، اللہ کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ ظالموں کی پکڑ ذرا دیر سے ہوتی ہے۔ یہ دُنیا بھی خود دارِ مکافات ہے۔ اعمال کا بدلہ کسی نہ کسی حد تک یہاں پر ہی مل جاتا ہے۔ دوسروں کا گھر اُجاڑ کر اور مال لوٹ کر کوئی بہت دن تک سُکھی نہیں رہ سکتا —— یہ

لوگوں کے قیاس، خیال، اندازے اور حاشیہ آرائیاں تھیں۔ جب کسی کی بگڑتی ہے تو اس کی اچھائیاں برائیاں بنا دی جاتی ہیں۔ ہُنر عیب ہو جاتے ہیں۔ دُنیا گرتے کے لات مارتی ہے اور دوڑتے کے پاؤں چومتی ہے۔

پولیس نے سرفراز اور آفتاب کو مجرم ثابت کرنے کے لئے بہت کچھ ثبوت مہیا کر دیا۔ پولیس کو ہر قسم کے مقدمہ میں گواہ آسانی سے مل سکتے ہیں اور یہاں تو بہرحال ایک سنگین واقعہ ظہور میں آیا تھا، دو آدمی عین ڈکیتی کے وقت گرفتار ہوئے تھے۔ ثبوت کو وزنی بنانے کے لئے پولیس کی طرف سے بہت ہی معتبر اور مفصّل شہادتیں پیش ہوئیں۔ ملزمین کے ابتدائی بیانوں کو غلط ثابت کرنے کے لئے اسی روشنی میں پولیس نے پیروی کی۔ پولیس کے گواہوں نے گنگا جل ہاتھ میں اُٹھا کر کہا کہ ڈکیتی سے چند دن پہلے سرفراز اور آفتاب کو گاؤں کے قریب گواہوں سے بنیئے کے گھر بار کا حال دریافت کرتے دیکھا گیا۔ ایک گواہ نے شہادت دی کہ ڈاکہ میں گولی ملزم نمبر ۱ (آفتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کے حکم سے چلتی تھی اور سرفراز نے بنیئے کی ماں کو دھمکا کر تجوریوں کی کنجیاں حاصل کیں۔ عدالت کی طرف سے دریافت کیا گیا کہ کیا دونوں ملزموں پر اس سے پہلے پولیس کو کسی قسم کا شبہ تھا اور کیا بدمعاشوں کے رجسٹر میں ان کے ناموں کا کہیں اندراج ہے؟ پولیس نے اس کے جواب میں ایک دو شہادتیں پیش کرا دیں کہ دونوں ملزم شرابیں پیتے ہیں۔ جُوا کھیلتے ہیں، عیاشیاں کرتے ہیں اور اسی قسم کی بہت سی بے اعتدالیوں میں مُبتلا ہیں۔

مقدمہ کی نوعیت بہت زیادہ سنگین ہو گئی تھی۔ وکیلوں کی پیشگوئی

تھی کہ ملزم سزا یاب ہو کر رہیں گے۔ جرح میں ثبوت کے بعض گواہ ٹوٹ چکے ہیں۔ اور ثبوت مجروح ہو چکا ہے مگر پھر بھی واقعات کا تسلسل اور موقعِ واردات پر ملزموں کا گرفتار ہونا اتنا بڑا ثبوت ہے کہ مضبوط سے مضبوط صفائی سے بھی اُس کی تردید نہیں ہو سکتی ——— عدالت کو بس ایک شہادت کا انتظار تھا اور وہ گواہی بنیئے کی مجروح لڑکی کی تھی۔ بنیئے کی لڑکی پر مسلسل بیہوشی کے دورے پڑتے رہے اور وہ بہ صحت ہوش و حواس بہت دن تک بیان دینے کے قابل نہ ہو سکی۔ لڑکی کی شہادت پر مقدمہ کا دار و مدار تھا۔ لڑکی اس واقعہ کی سب سے بڑی عینی شاہد تھی۔

پولیس نے لڑکی کے گھر والوں سے کہا کہ تمہاری لڑکی کے بیان میں خامی رہ گئی تو ملزم بَری ہو جائیں گے۔ اُس سے عدالت میں یہ کہلوانے کی ضرورت ہے کہ سرفراز نے مجھ پر دست درازی کی اور جب میں نے مدافعت کی تو آفتاب نے مجھ پر گولی چلا دی، لڑکی نے انکار کیا تو اُس کے گھر والے کہنے لگے کہ تم ہمیں عدالت میں اُلٹا ملزم بنا دینا چاہتی ہو۔ تمہارے بیان پر مقدمہ کا انحصار ہے۔ مقدمہ چھوٹ گیا تو پولیس ہماری دشمن ہو جائے گی اور پولیس کی دشمنی کے بعد کوئی شریف آدمی عزت آبرو کے ساتھ رہ نہیں سکتا۔ تم ایشور کے لئے ہماری عزت کو خاک میں نہ ملاؤ۔ اب رہا جھوٹ سچ تو اس دُنیا میں بعض وقت آدمی کو تھوڑا بہت جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے۔ صرف سچائی سے زمانے کا کاروبار نہیں چلتا۔ تمہارا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ گولی ان دونوں میں سے کسی نے نہیں چلائی اور کسی نے تم پر ہاتھ نہیں اُٹھایا مگر یہ دونوں آخر ہیں تو

ڈاکوؤں کے ساتھی۔ وہ ہمارے گھر ڈاکہ ڈالنے کے لئے ہی تو آئے تھے۔ ایسے کھلے ہوئے دشمنوں اور ریاپی لٹیروں کے خلاف جو کچھ بھی کہا جائے تھوڑا ہے۔ ہم تو ان ڈاکوؤں کو پھانسی کے تختہ پر دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ دوسروں کو نصیحت ہو۔

آفتاب اور سرفراز نے اپنے بیانات میں تمام واقعات ٹھیک ٹھیک بیان کر دیئے۔ وکیل سرکار کی جرح میں واقعات کی ترتیب میں تو کچھ الٹ پھیر ضرور ہو گیا مگر اُن کے بیانات مجروح نہیں ہوئے۔ سچائی لاکھ شکنجوں سے گزرنے کے بعد بھی سچائی ہی رہتی ہے۔ ان دونوں کے بیانات میں ذرا سا بھی تضاد واقع نہیں ہوا۔ صفائی کی طرف سے کہا گیا کہ آفتاب نے ڈاکوؤں کے سردار کے ہاتھ سے بندوق چھینی تھی۔ آفتاب کے پاس پہلے سے بندوق ہوتی تو کارتوسوں کی پیٹی بھی اُس کے پاس ہونی چاہیئے تھی۔ ثبوت اور صفائی کی شہادتوں کے تضاد اور تواردنے واقعات کو کچھ اُلجھا سا دیا تھا اور اس اُلجھن کا سُلجھاؤ بنیئے کی لڑکی کے بیان پر منحصر تھا۔ قریب قریب تمام شہادتوں میں لڑکی کا ذکر آیا اور اُس کا نام بار بار لیا گیا۔ اس طرح اُس کی شہادت فیصلہ کُن نوعیت کی حامل بن گئی تھی۔

لڑکی عدالت میں آئی۔ زخم اچھے ہو چکے تھے۔ بیماری نے اُس کے گداز جسم میں نزاکت پیدا کر کے اُسے اور نازنین بنا دیا تھا۔ آفتاب اور سرفراز ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے تھے۔ لڑکی نے بڑی مشکل سے آنسوؤں کو ضبط کیا۔ اپنے ہمدرد اور غمخوار کو پریشانی اور مصیبت میں دیکھ کر ہر کوئی متاثر ہوتا ہے

لڑکی نے نہایت جرأت اور بے باکی کے ساتھ سچّی سچّی باتیں اور گزرے ہوئے واقعات بلاکم و کاست بیان کر دیئے۔ اُس کی باتوں میں نہ کوئی قانونی پیچیدگی تھی اور نہ کسی کی پاس و مُروّت اور رُو و رعایت کو دخل تھا۔ وکیل سرکار کی جرح اور عدالت کے درمیانی سوالات نے حقیقتِ حال کو اور زیادہ واضح کر دیا۔ گاؤں کی لڑکی مینا کی طرح عدالت میں بول رہی تھی۔ بے گناہوں اور اپنے ہمدردوں کو چھڑانے کے احساس نے اُس میں غیر معمولی جُرأت اور قابلیت پیدا کر دی تھی۔ ایسے موقعوں پر آدمی اپنی بساط، ہمت، اور مقدرت سے بڑھ کر کام کر جاتا ہے۔ لڑکی کے بیان نے واقعہ کی صحیح تصویر عدالت کے سامنے پیش کر دی۔ اُلجھنیں دُور ہو گئیں۔ پردے اُٹھ گئے۔ کھوئی ہوئی کڑیاں مل گئیں۔ اور واقعات اپنے اصلی روپ میں سامنے آ گئے ــــــ"

اس واقعہ کے چند دن بعد اخباروں میں جلی عنوانات کے ساتھ ایک خبر شائع ہوئی جس نے عوام و خواص کو بے حد متاثر کیا ــــــ

ڈاکو نہیں، رحمت کے فرشتے!

عدالت نے ملزموں کو بری کر دیا۔

ڈکیتی کے مشہور مقدمہ کا فیصلہ ہو گیا۔

سرفراز اور آفتاب کے گھر والے شکر کے سجدے کر رہے تھے اور ساہوکار کی لڑکی خوشی خوشی مندر میں پھول چڑھانے کے لئے جا رہی تھی۔ دوشیزگی کے معصوم تبسّم نے مندر کے بام و در کو جگمگا دیا ــــــ ✢

رنگینیوں کا انجام

—— دیکھا، تمہارا چہیتا اور لاڈلا بیٹا فلسفیوں کی صحبت میں بیٹھکر نیم پاگل ہوگیا —— بوڑھے یونانی نے تاثر انگیز لہجہ میں کہا۔

—— "تم تو سدا بدشگونی کی باتیں کرتے رہتے ہو" عورت نے اپنے سفید بالوں پر ہاتھ پھیر کر جواب دیا۔

"سچی بات کا اظہار اور کسی آنے والے خطرے سے آگاہی بدشگونی ہے؟ تم یا تو نی عورتوں کے پاس ایک آدھ رتی عقل بھی مشکل ہی سے ہوتی ہوگی! کوئی باپ اپنے بیٹے کا بُرا نہیں چاہ سکتا۔ تم مجھ سے زیادہ اُس کی ہمدردی نہیں کر سکتیں۔ تمہاری ہمدردی اور غمخواری میں محبّت اور اندھی محبّت شامل ہے۔ اور میری ہمدردی میں محبّت اور عقل کی آمیزش ہے" —— بوڑھا گہری سانس لے کر بولا۔

"تو تم مجھ ڈکھیا سے لڑنا چاہتے ہو؟ کچھ میں نے کہا اور کچھ تم نے! اس طرح بات بڑھ گئی تو دیکھنے والے ہنسیں گے کہ بُڑھاپے میں میاں بیوی میں جنگ ہو رہی ہے" —— عورت نے کُرتے کا گریبان کھینچتے ہوئے کہا۔

—" لڑنا تو تم چاہتی ہو، میں نے تو بس اتنا کہا تھا کہ تمہارا لڑکا فلسفیوں کی محفلوں میں بیٹھ کر خبطی ہو گیا ہے —" بوڑھا بولا۔

—" تو آخر ہوا کیا؟ سارے جہان کی باتیں کئے جاتے ہیں اور مطلب کی بات نہیں کہی جاتی ——" عورت نے پوچھا۔

" دیکھتی نہیں ہو کہ انطون ہر وقت گہرے سوچ میں رہتا ہے، کھانا کھاتے ہیں اُس کا دماغ فلسفہ کی گتھیاں سلجھاتا ہے، چلتے میں بھی وہ سوچتا ہے۔ کل تو غسل خانہ میں وہ آپ ہی آپ باتیں کر رہا تھا۔ سوچ بچار کا یہی عالم رہا تو وہ یقیناً پاگل ہو جائے گا۔ اور نیم پاگل تو وہ اس وقت ہے۔"

بوڑھے نے بات ختم کی ہی تھی کہ ایک سفید ریش آدمی سیاہ ریشم کی عبا پہنے اُس دوکان میں داخل ہوا۔ اُس کو دیکھتے ہی بوڑھا نووارد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا:—

" میری بات جھوٹ سمجھتی ہو تو ان حضرت تائیس سے پوچھ لو۔ یہ شہر کے فلسفیوں اور اُن کے نوجوان شاگردوں کے حالات سے پورے طور پر باخبر ہیں۔ فلسفہ کا تھوڑا بہت شوق ان کو بھی ہے۔ مگر یہ شوق دیوانگی کی حد تک نہیں پہنچا۔ ہوشمند اور جہاندیدہ آدمی ہیں۔ فلسفہ کے شوق میں اپنی زندگی تباہ کرنا نہیں چاہتے۔

تائیس تخت پر بیٹھتے ہوئے مسکرایا اور اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولا:—

" اگر آپ لوگ صلح صفائی چاہتے ہیں تو مجھے حقیقت چھپانی پڑیگی۔ یعنی یہ کہ آپ کا فلسفہ زدہ نقد و نظر انطون فلسفیوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا

اُسے کاروباری باتوں سے دلچسپی ہے۔ وہ ایک کامیاب تاجر اور اچھا صنّاع بننا چاہتا ہے۔ مستقبلِ قریب میں وہ آپ کو فکرِ روزگار سے بے نیاز کردیگا۔ کہو تھوڑی نہ بر کے لئے خوش ہونا چاہئے ہو یا۔۔۔۔ (انطون کا باپ بیچ میں بول اُٹھا کہ ہماری خوشی کے لئے آپ حقیقتِ حال کے اظہار میں کوتاہی نہ کیجئے)۔ تو پھر سنو! ہمارے یونان کے یہ جوشیلے لونڈے فلسفہ کے پیچھے سچ مچ دیوانے ہوگئے ہیں۔ زیادہ سوچ بچار اور غور و فکر کرنے والا آدمی بے عمل ہو جاتا ہے۔ اور استغراق کی شدت قوائے عملیہ کو بے کار کردیتی ہے۔ فلسفہ میں اتنی اچھائی تو ضرور ہے کہ مسائل کی باریکیاں سمجھنے کی ذہن میں صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ فلسفیانہ اُلجھاؤ میں ڈال کر اپنے حریف کو خاموش اور حیران کیا جا سکتا ہے۔ بس اس کے سوا تو پھر خبط ہی خبط اور جنون ہی جنون ہے۔ (جنون، پاگل پن بلکہ مکمل دیوانگی اور خطرناک خبط —— انطون کے باپ نے تائیس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا) —— یہ فلسفی علم و فضل اور تحقیق کے بہت بلند دعوے کرتے ہیں مگر یہ خود بہت سے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ لذتیین کا گروہ لذت ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے کہ کھاؤ پیو۔ مزے اُڑاؤ، عیش کرو۔ کھیلو کودو اور لذات کے اسی ہجوم میں مسکراتے ہوئے مرجاؤ۔ دوسرا گروہ اس کی بالکل ضد ہے۔ وہ لوگ ترکِ دُنیا اور رہبانیت کی طرف مائل ہیں۔ غضب خدا کا ان میں سے بعض فلسفی تو برسوں گزر جاتے ہیں اور نہانے کا نام نہیں لیتے۔ اسی گروہ کے ایک فلسفی سے اُس کے عقیدتمندوں نے تصویر کھچوانے کے لئے کہا تو وہ پیشانی پر بل ڈال کر

بولا ۔
"آدمی کا جسم سایہ ہے اور سایہ کی تصویر کھینچنا حماقت اور فعلِ عبث ہے "۔
فلسفہ کے سب سے بڑے امام ارسطو اور افلاطون ہیں (اتنے میں انطون وہاں آگیا) "آپ ارسطو اور افلاطون کا ذکر فرما رہے تھے ـــــ؟"
انطون نے خوش ہو کر کہا ۔
"جی ہاں! میں یہ کہہ رہا تھا کہ ارسطو اور افلاطون بھی ایک نقطہ پر متفق نہیں ہیں ـــــ" تائیس نے جواب دیا ۔
"اپنے قول کی ذرا وضاحت فرما دیجئے" ـــــ انطون تخت پر بیٹھتے ہوئے بولا ۔
"بُرا تو نہ مانو گے میاں صاحبزادے!" ـــــ تائیس نے مسکرا کر کہا ۔
"سچی بات کسی کی ناخوشی کے خوف سے چھپانا نیکی کی سب سے زیادہ خطرناک ضد ہے"۔ ـــــ انطون نے جواب دیا ۔ اور اتنے میں ملازمہ بڑی سے طباق میں بھُنا ہوا گوشت اور اُبالی ہوئی ترکاری لے کر آگئی اور سب کھانے میں مصروف ہو گئے ۔ کھانے کے درمیان تائیس اور انطون میں نوک جھوک بھی ہوتی جاتی تھی ۔
تائیس :۔ "یہ تو بتاؤ انطون! بھُنا ہوا گوشت زیادہ مفید اور لذت بخش ہوتا ہے یا فلسفیانہ مسائل؟"

انطون :۔ بھُنے ہوئے گوشت اور فلسفہ کے مسئلوں میں آخر مماثلت کیا ہے
اور ان میں کیا چیز قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو آپ اُن کا
تقابل کرانا چاہتے ہیں؟

تائیس :۔ لذّت ــــــ میاں صاحبزادے!

انطون :۔ مگر لذت کے بھی مختلف مدارج اور متضاد محرّکات ہوتے ہیں۔
ایک ظالم بے گناہ پر ظلم کر کے لذّت حاصل کرتا ہے۔ ڈاکو دوسرے کا
مال لوٹ کر خوش ہوتا ہے۔ چالاک عیّار اور خبیث فطرت انسان
کو دھوکا دینے میں لذّت حاصل ہوتی ہے۔ ایک نیک آدمی کو بھلائی
میں لذّت ملتی ہے۔ مصوّر کو تصویریں۔ مغنّی کو نغموں میں۔ شرابی کو
شراب میں اور عابد و مرتاض کو خدا کی عبادت میں لذّت کا احساس
بلکہ عرفان ہوتا ہے۔

تائیس :۔ میں نے بھی فلسفہ پڑھا ہے انطون! تم مجھے فلسفیانہ دلائل میں مشکل
ہی سے اُلجھا سکو گے۔ ارے میاں! لذّات کے مدارج مختلف ہو سکتے
ہیں مگر جہاں تک نفس لذت کا تعلّق ہے۔ اُس میں کوئی فرق اور تفاوت
نہیں ہے!

انطون :۔ نفس لذت ایک فریب ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ ایک خوشنما اصطلاح!
احساس لذّت محرّکات و مدارج سے وابستہ ہے۔ اگر ظالم اور خدا ترس
کی لذّت میں کوئی فرق نہ ہو۔ اور دونوں اپنے افعال میں یکساں لذت
محسوس کریں۔ تو پھر گناہ و ثواب اور نیکی و بدی ایک ہی سطح پر آجاتے ہیں اور

اس طرح نظامِ معاشرت اپنی صالحانہ قدر اور عادلانہ قیمت کھو بیٹھتا ہے۔

تائیس :۔ تو کیا کھانوں میں لذت حاصل کرنا کوئی بری بات ہے؟۔

افلاطون :۔ جی نہیں!

تائیس :۔ اور فلسفیانہ مسائل سے لذت اندوز ہونا بھی برا نہیں ہے؟

افلاطون :۔ بے شک!

تائیس :۔ تو پھر حقیقت واضح ہو گئی اور تم نے خود ہی تسلیم کر لیا کہ فلسفیانہ مسائل کے غور و فکر کا لطف اور کھانا کھانے کی لذت بری نہیں ہے اچھی ہے۔ اسی مشابہت اور یکسانیِ لذت کی بنیاد پر میں نے دریافت کیا تھا کہ ان دونوں میں زیادہ لذت کس میں ملتی ہے۔

افلاطون :۔ لذت کی یہ مشابہت اور یکسانیت بالکل خیالی اور قطعًا وہمی ہے۔ پھول اور پتھر دونوں اپنے اندر افادیت رکھتے ہیں۔ پھولوں کی خوشبو سے دماغ لطف اندوز ہوتا ہے اور اُن کے نظارے سے آنکھیں خوشی حاصل کرتی ہیں۔ پتھروں سے مکان بنتے ہیں جن کے سایے میں آدمی آرام کر کے لذت پاتے ہیں تو کیا افادیت اور لذت کی اس یکسانیت کے سبب ہم پھول اور پتھر کا ایک دوسرے سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔

تائیس :۔ ہم پھول اور پتھر کا نہیں فلسفہ اور ماکولات کا ذکر کر رہے تھے

افلاطون :۔ اجی حضرت! فلسفیانہ مسائل اور کھانے کی لذت میں زمین

آسمان کا فرق ہے۔ لذیذ کھانے سے کام و دہن لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور فلسفیانہ مسائل کی گرہ کشائی میں روح کو مزہ آتا ہے۔

تائیس :۔ فلسفہ اور مسائل کی گرہ کشائی! (قہقہہ لگا کر)

انطون کا باپ :۔ بھئی! کچھ کھاتے بھی جاؤ۔ گوشت ٹھنڈا ہوا جا رہا ہے۔

(تائیس گوشت کا ٹکڑا اور انطون شلجم کا قتلہ اٹھاتا ہے۔)

انطون :۔ تو فلسفہ مسائل کی گرہ کشائی نہیں کرتا؟ آپ قہقہوں سے فلسفہ کی عظمت کم کرنا چاہتے ہیں؟

تائیس :۔ معلوم ہوتا ہے تم نے فلسفہ کچھ یوں ہی سا پڑھا ہے۔

انطون :۔ میں نے عالم ہونے کا دعویٰ کب کیا تھا۔

تائیس :۔ تم نے تو میرے سوال پر ہی اعتراض کر کے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ میں فلسفہ میں بہت گہری نظر رکھتا ہوں۔

انطون :۔ آپ مجھ پر تہمت تراش رہے ہیں۔

انطون کا باپ :۔ گستاخ نہ بنو انطون! یہ تمہارے باپ کی برابر ہیں۔

تائیس :۔ نہیں! بولنے دو! جوان آدمی کا خون گرم جوش میں نہ آئے گا تو کیا ہم بوڑھوں کا لہو پیچ و تاب کھائے گا۔ (انطون کی طرف متوجہ ہو کر) بھئی! تم نے ابتدا میں کہا تھا کہ بھنے ہوئے گوشت اور فلسفہ میں کیا مماثلت ہے؟ تو تمہاری طرف سے میرے قول کی تردید حقیقت میں تمہارے عالم ہونے کا دعویٰ تھا۔

انطون :۔ تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ غیر عالم کو کسی بات میں بولنے کا حق ہی نہیں

ہے۔ وہ بے چارہ اس ڈر سے کہ کہیں لوگ اُس کو عالم ہونے کے بلند بانگ
دعووں سے متہم نہ کر دیں اپنے منھ پر بخیہ کرکے بیٹھا رہے۔

تائیس :- جس چیز کو جو شخص جانتا ہے وہ اُس کا عالم ہے۔ تمہیں یہ احساس تھا
کہ تم فلسفیانہ مسائل اور کھانے کی لذت میں فرق کر سکتے ہو اور تمہیں
دونوں کی لذتوں کا شعور اور علم حاصل ہے اس لئے تم کو میں نے
عالم کہہ دیا تو اس میں جھوٹ کیا ہے؟ اگر علمیت کے دعوے کی تہمت
سے تم بچنا چاہتے تھے تو میری بات پر تمہیں خاموش ہو جانا چاہئے تھا۔

انطون :- تو لیجئے میں اب چپ ہوا جاتا ہوں۔

تائیس :- اب خاموشی بے کار اور بعد از وقت ہے۔ جب بحث چھڑ گئی ہے
تو اسے ہم ناتمام نہ چھوڑیں گے! اور ہاں تمہارے اس کہنے میں بھی
کہ لیجئے میں اب چپ ہوا جاتا ہوں ایک قسم کا غرور جھلکتا ہے۔

انطون :- یہ تو وہی بات ہوئی کہ چت بھی میری اور پٹ بھی میری۔ میں کچھ
کہتا ہوں تو آپ فرماتے ہیں کہ تم علم و فضل کا دعوے کر رہے ہو۔
خاموش رہتا ہوں تو اسے غرور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تو آخر میں کیا
کروں؟ کسی محفل میں آدمی دو ہی کام کر سکتا ہے یا تو باتیں کرے
یا چُپ رہے۔ گفتگو و خموشی کے سوا اور تیسری بات تو میری
سمجھ میں نہیں آتی۔

تائیس :- فلسفیوں کی سمجھ میں کوئی بات بھی نہیں آسکتی۔

انطون :- دیکھئے حضرت! آپ مجھے جو چاہے کہہ لیجئے مگر فلسفیوں پر حرف گیری

نہ فرمائیے۔ پیٹھ پیچھے کسی کو برا بھلا کہنا اخلاقی نقطۂ نگاہ سے پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔

تائیس :۔ اور اگر فلسفیوں نے اپنی ناسمجھی کا اعتراف کیا ہو تو (تائیس نے پانی کے لئے اشارہ کیا، افلاطون کی ماں نے ملازمہ کو آواز دی، وہ پیالہ میں پانی لے کر آئی اور تائیس ایک ہی سانس میں پیالے کا سارا پانی پی گیا۔)

افلاطون :۔ میں سمجھا نہیں۔

تائیس :۔ میں یہی تو کہہ رہا تھا کہ فلسفی حقائق کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ سنیئے! اور غور سے سنیئے!! مشہور فلسفی دیوجانس کلبی کے مایۂ نازش شاگرد حکیم کارنیا ڈیز نے اس بات کا اعلان کیا اور بار بار اعلان کیا کہ ادراکِ انسانی سے ماہیتِ اشیاء کی سطح بہت بلند ہے۔ انکسا غورث کہتا ہے کہ کوئی چیز معلوم نہیں ہو سکتی۔ کسی حقیقت کے چہرے سے پردہ نہیں اُٹھ سکتا۔ حقیقت نامحدود ہے۔ اور انسان کی زندگی بہت قلیل اور قوتِ احساس نامحدود ہے۔ اسی طرح دوسرے فلسفیوں نے بھی ادراکِ حقیقت میں اپنے عجز کا اعتراف کیا ہے۔ حکیم آرسیلیس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مجھے کسی شے کا علم نہیں۔ یہاں تک کہ اپنی لاعلمی کا بھی علم نہیں ——— یہ ہیں آپ کے فلسفہ کے مقدس اماموں کے فتوے! اور اُن کے ارشاداتِ گرامی!

افلاطون :۔ فلسفیوں میں دو گروہ ہیں۔ ایک متشککین کا اور دوسرا متیقنین کا! یہ آپ اہل تشکیک کی باتیں کر رہے ہیں۔ تصویر کے دوسرے رُخ کو بھی

دیکھئے قبلہ!

تائیس :۔ اس وقت آپ کے ذہن میں ارسطو اور افلاطون کا تصوّر کروٹیں لے رہا ہے۔

انطون :۔ تو آپ دلوں کا حال بھی پڑھ لیتے ہیں؟

تائیس :۔ جی! میں نے فلسفہ سے ہٹ کر حقائق ونفسیات کا تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے۔

انطون :۔ مگر آپ کی بحث وگفت گو کا انداز ٹھیٹ فلسفیانہ ہے۔

تائیس :۔ لیکن اس کی رُوح فلسفیانہ نہیں ہے۔

انطون کا باپ :۔ آپ دونوں کی باتوں میں بڑا لطف آ رہا ہے۔

انطون :۔ فلسفہ کی باتیں اور بحثیں بڑی دل چسپ ہوتی ہیں ابا جان!

انطون کی ماں :۔ مگر مجھے تو اُلجھن سی ہو رہی ہے۔

انطون :۔ تو آپ صحن میں جا کر بچوں کی گدگدی کیجئے۔ باورچی خانہ میں ماما کو ملاحیاں سُنائیے۔ اُس میں آپ کو لذّت ملے گی (سب لوگ ہنسنے لگے)۔

ماں :۔ تو میرا یہاں بیٹھنا تجھے ناگوار ہے انطون!

انطون :۔ میں تو خدا سے چاہتا ہوں کہ آپ کو فلسفیانہ باتوں سے دل چسپی پیدا ہو جائے۔ آپ ہی فرما رہی ہیں کہ مجھے تمہاری بحث سے اُلجھن ہو رہی ہے! اس پر میں نے عرض کیا کہ جن کاموں میں آپ کو لطف آئے وہ کام کیجئے۔

انطون کا باپ :۔ ماں بیٹوں کی لڑائی میں بحث ناتمام رہ جائے گی۔ تائیس!

آپ افلاطون اور ارسطو کا ذکر فرما رہے تھے۔

تائیس :۔ جی ہاں! میں یہ کہہ رہا تھا کہ فلسفۂ رجائیت کے ان دونوں اماموں (ارسطو اور افلاطون) نے بھی عرفانِ کامل اور ادراکِ حقائق کا دعویٰ نہیں کیا۔

انطون :۔ مگر انہوں نے یہ بھی نہیں کہا کہ ہم کچھ نہیں جانتے اور حقائق کا ادراک چونکہ ناممکن ہے اس لئے آدمی کو کچھ سوچنا اور غور کرنا نہیں چاہیے۔ بس آدمی کی سب سے بڑی کامیابی اور فائدہ اس میں ہے کہ وہ گوشت کھائے۔ شرابیں پیئے، اچھے کپڑے پہنے اور خوب آرام کی زندگی بسر کرے۔

تائیس :۔ آرام اور آسائش کی زندگی بسر کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔

انطون :۔ اور فلسفیانہ مسائل پر غور و خوض کرنا بھی جُرم نہیں ہے!

تائیس :۔ مگر اس غور و فکر سے اُلجھنیں بڑھتی ہیں اور زندگی بے آرام سی ہو جاتی ہے۔

انطون :۔ لیکن کسی کی زندگی کے آرام اور بے آرامی کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق کسی دوسرے کو نہیں پہنچتا۔ مجھے فلسفیانہ مسائل میں لُطف آتا ہے اور اسی کو میں زندگی کا آرام سمجھتا ہوں اور ــــــــ

باپ :۔ (بات کاٹتے ہوئے) یہ بیچ میں پھر زندگی کی اُلجھنوں کا ذکر نکل آیا اور افلاطون و ارسطو کی بات ادھوری رہ گئی۔

تائیس :۔ فلسفہ کی گتھی سلجھانے سے اور اُلجھتی ہے دوست! مسائل شاخ در شاخ اور گرہ در گرہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ فلسفہ کسی بات کا فیصلہ قطعی نہیں کر سکتا یہ فلسفہ کی خاصیت ہے۔

انطون :۔ دیکھئے! آپ نے فلسفہ کی بُرائی شروع کر دی۔ مجھے اس سے تکلیف ہوتی ہے۔

تائیس :۔ مگر میں نے تو تم سے پہلے ہی پوچھ لیا تھا کہ میری بات کا بُرا تو مانو گے، تم نے جواب دیا کہ کسی کی ناخوشی کے خوف سے سچّی بات چھپانا نیکی کی ضد ہے۔ یاد ہے اپنا قول؟

انطون :۔ نو قبلہ! اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ کوئی کسی کی پسندیدہ اور محبوب چیز کو گالیاں بھی دیتا رہے تو بھی سننے والا زبان سے اُف نہ کرے۔

تائیس :۔ پوری بات سننے اور سمجھنے کے بعد اُسے کچھ کہنے کا حق حاصل ہے! ہو سکتا ہے کہ جو باتیں ابتدا میں ناگوار معلوم ہوتی ہیں وہ آخر میں جا کر مستحسن نظر آنے لگیں۔

انطون :۔ اچھا حضور! فرمائیے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔

تائیس :۔ میں کہہ رہا تھا کہ افلاطون اور ارسطو بھی اپنی تمام دماغی کاوشوں اور عرق ریزیوں کے باوجود حقیقت کا پتہ نہیں لگا سکے۔ وہ بے چارے اخلاق اور نیکی کا درس دیتے تھے۔ مگر انہوں نے اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ اخلاق اور نیکی کی حقیقت ان کو معلوم ہو گئی ہے۔

انطون :۔ تو یوں کہئے کہ وہ احمق اور بے وقوف تھے۔

تائیس :۔ میں نے تو اس قسم کا ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا۔ دُنیا کے تمام مشاہیر اور نامور لوگوں کا میں احترام کرتا ہوں، انطون!

انطون :۔ ارسطو اور افلاطون آپ کے بقول جب نیکی اور اخلاق کی حقیقت سے نابلد تھے تو ایک نامعلوم بات کی تبلیغ اور مخلوقِ خدا کو اُس طرف بُلانا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

تائیس :۔ وہ بالکل ناواقف تو نہ تھے۔

انطون :۔ تو وہ کس حد تک واقف تھے ، آپ بتا سکتے ہیں؟

تائیس :۔ ہم سب سے زیادہ۔

انطون :۔ اگر میں آپ کے مفہوم کے لئے یہ عرض کروں تو غالباً بیجا نہ ہوگا کہ انسانوں کی سوسائٹی کے مفاد کے لئے نیکی اور اخلاق کا جتنا علم ضروری ہے اُتنا علم ارسطو اور افلاطون کو حاصل تھا۔

انطون جواب دے ہی رہا تھا کہ ہوا کے تیز جھونکے نے کمرے کی چراغ کو گل کر دیا۔ انطون کی بڑھیا ماں نے ملازمہ کو آواز دی کہ جلتی ہوئی لکڑی لے کر آؤ۔ یہاں اندھیرا ہو گیا۔ انطون کے باپ نے تائیس سے کہا کہ گفتگو کا سلسلہ جاری رکھیئے۔ تائیس نے جواب دیا۔ میں تو اندھیرے میں بات چیت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ اُجالے کے بعد تاریکی میں مجھے انقباض سا محسوس ہو رہا ہے۔ میں بحث کرتے میں اپنے مقابل کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھتا جاتا ہوں۔ اندھوں کی طرح بات کرنے میں مجھے ذرا سا بھی لطف نہیں آتا۔ الفاظ مشاہدے کے ساتھ اپنی پوری طاقت کا اظہار کر سکتے ہیں۔ ملازمہ نے آکر چراغ جلا دیا اور شمع کے جلتے ہی اندھیرا رخصت ہو گیا۔

تائیس :۔ ایک بات پوچھوں ؟ بتاؤ گے انطون !

انطون :۔ معلوم ہو گی تو ضرور بتاؤں گا۔ بشرطیکہ مجھ پر غرور کا الزام نہ لگایا جائے !

تائیس :۔ جب تم اس کمرے میں آئے ہو تو شمع جل رہی تھی۔

انطون :۔ جی ہاں!

تائیس :۔ ہوا کے جھونکے نے شمع کو بجھا دیا۔

انطون :۔ یہ تو آپ بھی دیکھ رہے تھے۔

تائیس :۔ اور ماما نے پھر شمع کو روشن کر دیا۔

انطون :۔ بے شک! ایسا ہی ہوا۔

تائیس :۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ شمع جب تک جلی نہ تھی تو شعلہ کہاں تھا؟
اور جلنے کے بعد کہاں سے آگیا؟

انطون :۔ (بہت دیر تک سوچتا رہتا ہے) مجھے اس پر تنہائی میں غور کرنا ہوگا
جب آپ کے سوال کا جواب عرض کر سکوں گا۔

تائیس :۔ تمہارے سامنے روزانہ شمع جلائی اور بجھائی جاتی ہے۔ تم نے اس
کی حقیقت پر آج تک غور نہیں کیا

انطون :۔ یہ نکتہ میرے ذہن ہی میں نہیں آیا۔

تائیس :۔ دیکھا تم نے! کتنی حقیقتیں ہیں جن کو انسانوں نے ابھی تک نہیں سمجھا
اور کتنی باریکیاں اور نزاکتیں ہیں جو ابھی تک تشنۂ غور و فکر ہیں۔

انطون کا باپ :۔ ارسطو اور افلاطون کا ذکر پھر الجھن میں پڑ گیا۔

تائیس :۔ آپ تو ان دونوں فلسفیوں کے مرید معلوم ہوتے ہیں؟

انطون :۔ ہر عقلمند فلسفہ کے ان ستونوں سے متاثر ہے۔

تائیس :۔ میں بحث کو مختصر کرنے کی غرض سے بات بڑھانا نہیں چاہتا۔ لیجئے
سُنیے! ارسطو اور افلاطون کے سوچنے کے طریقے مختلف ہیں۔ ارسطو

عمل استقراء کا قائل ہے۔ یعنی وہ جزئیات کے مطالعہ اور مشاہدے سے کلیات اخذ کرتا ہے۔ اور افلاطون کے یہاں کلیات سے ابتدا کی جاتی ہے اور پھر جزئیات مستخرج ہوتے ہیں۔ دونوں کے طریق غور و فکر میں اختلاف بلکہ تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک طرف تخئیل ہے اور دوسری طرف تعقّل۔

انطون :۔ اس میں آخر قابلِ اعتراض بات کیا ہے؟ جو آپ اس قدر شدّ و مد کے ساتھ بیان فرما رہے ہیں۔

تائیس :۔ خیال و عمل کا اختلاف و تضاد آپ کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا؟

انطون :۔ ایک ہی مقصد کے لئے طریقے اور ذریعے کے اختلاف سے کوئی فرق پیدا نہیں ہو جاتا۔ اور جہاں تک عمل کا تعلق ہے تو ایک آدمی کھانا کھانے سے پہلے پانی پی لیتا ہے اور دوسرا کھانا کھانے کے بعد پانی پینے کے اس اختلاف میں بُرائی کا ذرا سا بھی شائبہ نہیں پایا جاتا۔ اور نہ اس تضاد کو کوئی اہمیت دی جا سکتی ہے۔

تائیس :۔ میں نے جب فلسفیانہ مسائل اور کھانوں کا ذکر کیا تھا تو آپ بُرا مان گئے تھے اور اب آپ خود ہی کھانے پینے کا ذکر نکال رہے ہیں۔

انطون :۔ یہ تو مثال ہے۔

تائیس :۔ مگر آپ کے بقول جن دو چیزوں کے درمیان مشابہت نہ پائی جائے۔ اُن کو معرضِ بحث میں لایا ہی نہیں جا سکتا۔

انطون :- تو کوئی اور مثال دوں ؟ -

تائیس :- میاں صاحبزادے ! فلسفہ کی یہ مثالیں اور دلیلیں ہی تو دماغ کی نیم ربانی قوتوں کو غارت کرتی ہیں - اس فلسفہ نے بعض لوگوں کی دنیا ہی نہیں عقبیٰ بھی خراب کردی - امونیس سیکاس کا نام تو تم نے سنا ہوگا ؟ -

انطون :- جی ہاں ! فرمائیے تو -

تائیس :- یہ فلسفی عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا تھا - مگر فلسفیانہ خیالات نے اس کو مذہب کی طرف سے شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیا - یہاں تک کہ وہ مرتد ہوگیا - اس کی طبیعت نکتہ رس واقع ہوئی تھی - عیسائیوں کے مشہور عقیدہ تثلیث کی اس نے ایک نئی تعبیر کی اور اقانیم ثلاثہ ہی کو سرے سے بدل ڈالا ، اس ملحد فلسفی کے ارکان تثلیث باپ ، بیٹا اور روح القدس نہیں - بلکہ جوہرِ مطلق ، عقلِ فعال اور قوت تامہ ہیں -(اس پر انطون کے باپ نے بیٹے کو خشم آلودہ نگاہوں سے دیکھا -)

انطون :- فلسفہ افراد کے افعال کا ذمہ دار نہیں ہے - بھیڑوں کے گلے میں سیاہ ، سپید ، چت کبری سبھی طرح کی بھیڑیں ہوتی ہیں ——— اور جناب والا ..... - (اتنے میں ماما نے آکر کہا کہ انطون کے دوست دروازے پر کھڑے ہیں - اور انطون وہاں سے چلا گیا -)

انطون کے جانے کے بعد تینوں بات چیت کرنے لگے ، ہوا کے جھونکے سے شمع جھلملا کر رہ گئی اور بوڑھی عورت نے روشندان بند کر دیا -

تائیس انطون کے باپ کا ہمدرد دوست تھا اور ہمدرد اور مخلص آدمی

دوست کی خاطر روپیہ، وقت یہاں تک کہ اپنی جان کا بھی ایثار کر سکتا ہے۔ بہت

دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

انطون کی ماں :۔ یہ چھوکرا ہماری تو سنتا نہیں۔ آپ ہی اسے سمجھا بجھا کر ٹھیک کیجئے۔

چوبیس سال کی عمر ہو گئی اس کی۔ مگر ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔

تائیس :۔ آپ ہی لوگوں نے گندھا ڈال رکھا ہے۔ ورنہ انطون کی دس شادیاں ہو سکتی

ہیں۔

انطون کا باپ :۔ ہاں صاحب! اس لڑکے کا کہیں بیاہ کرا دیجئے۔ اس کی ماں کی بڑی تمنا

ہے! صاحبزادے ماشاءاللہ بڑے فرض شناس ہیں اور لائق ہیں۔ بہو گھر میں آکر

بہت خوش رہے گی۔

ماں :۔ (قدرے ملول ہو کر) :۔ بھیجو جی! میرے بیٹے کو تم برا نہ کہا کرو۔ تمہاری روز کی بددعاؤں

نے اس کی ایسی حالت کر دی ہے (تائیس کی طرف متوجہ ہوتی ہے) یہ (شوہر کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے) تو کچھ کر نہیں سکتے۔ ان سے تو فقرے کسنا اور زخموں پہ

نمک چھڑکنا آتا ہے۔ آپ خدا کے لئے انطون کی اصلاح کیجئے! اس کے بیاہ کے

کئی جگہ سے پیغام آ چکے ہیں۔ مگر وہ کہتا ہے کہ ابھی میں شادی کے مسئلہ پر غور کر رہا ہوں

نہ جانے وہ کب تک غور کرتا رہے گا! میں مرجاؤں گی تو شاید کہیں جا کر اس کا غور ختم ہوگا

انطون کا باپ :۔ میرے بعد مرنے کا نام لینا۔ پہلے مجھے تو موت ۔۔۔۔ (بات کاٹ کر)

ماں (جھنجھلا جاتی ہے) میں ان سے باتیں کر رہی ہوں تم بیچ میں کیوں ٹانگ اڑاتے ہو۔

(تائیس مسکراتا ہے) آپ کے انطون کو (شریلے انداز میں) لڑکیوں کو دیکھ کر وحشت سی

ہوتی ہے۔ اس کی سالگرہ کے موقع پر شہر کی خوبصورت لڑکیاں ہمارے یہاں آئی

تھیں مگر انطون کتاب پڑھتا رہا۔ تو آپ (اشرما کراده کرٹ جملے کہتی ہے)

تائیس:۔ میں تمہارا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا۔ تم نے اب تک مجھ سے کیوں نہیں کہا۔ اچھا یہ بتاؤ۔ فلسفہ کے سوا کبھیں کو دیا کسی اور کام سے اُس کو دلچسپی بھی ہے۔

انطون کا باپ:۔ مصوّری سے! فلسفہ کی کتابوں کے مطالعہ سے جو وقت بچتا ہے وہ تصویر کشی کی نذر ہو جاتا ہے۔

تائیس:۔ (مسکراتے ہوئے) تو میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا، تصویر، شعر اور موسیقی کے سہارے طبیعت میں بہت کچھ رنگینی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور مجھے تو بڑی حیرت ہے کہ مصوّری کا ذوق رکھنے کے باوجود انطون اتنا خشک کیوں ہے؟۔

انطون کا باپ:۔ فلسفہ کا شوق مصوّری کے ذوق پر غالب ہے۔

تائیس:۔ اُس کی بنائی ہوئی کوئی تصویر تو یہاں ضرور ہو گی۔ (انطون کا باپ دوسرے کمرے سے تصویریں اُٹھا کر لاتا ہے۔)

تائیس بہت غور کے ساتھ انطون کی بنائی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگا۔ تصویریں بہت زیادہ جاذبِ نظر تھیں، مصوّر کی چابک دستی ایک ایک لکیر سے ظاہر ہو رہی تھی۔ یہ تصویریں:۔

"فلسفیوں کے مُرقعے جن کے لبادے اور ڈاڑھیاں بہت نمایاں طور پر دکھائی گئی تھیں —— پرندوں کی تصویریں —— مناظرِ قدرت۔ —— بوڑھے فقیر —— نوجوان مزدور —— درخت اور پودے —— عورت کی بس ایک تصویر وہ بھی اس رنگ میں کہ ایک بوڑھی عورت

کنویں پر پانی بھر رہی تھی۔ اور محنت کے اثر سے اُس کے ہاتھوں کی نسیں اُبھر آئی تھیں۔

تائیس تصویروں کو دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔

"یہ آپ کا لڑکا بے مثال مصوّر ہے مگر ہے خشک دماغ! تصویریں بتا رہی ہیں کہ اُس کی لوحِ احساس نے صنفِ نازک کا اب تک کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ . . . بہر حال (انطون کی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے) کوشش کروں گا کہ وہ بیاہ کے لئے راضی ہو جائے۔ اور آپ بہو کو گھر میں دیکھ کر باغ باغ ہو جائیں"۔

تائیس نے اُس دن سے انطون کے پاس آنا جانا شروع کر دیا، وہ اپنے یہاں انطون کو کھانے پر بلاتا۔ اُس کے یہاں کوئی بہانہ نکال کر جاتا اور گھنٹوں بات چیت رہتی۔ تائیس نے ابتدا میں کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے انطون پر یہ ظاہر ہو جاتا کہ وہ کسی خاص غرض کے لئے اُس سے ربط ضبط بڑھا رہا ہے۔ تائیس غیر محسوس طور پر انطون کے ذہن کو بدل رہا تھا۔ وہ انقلاب بہت دیر پا ہوتا ہے جو دبے پاؤں آکر ذہن و خیال اور قلب و دماغ میں گھل مل کر رہ جائے۔ تائیس نے یہ دیکھ کر کہ انطون کو مذہب سے خاص ذوق ہے۔ اور یونانی علم الاصنام سے بھی وہ فلسفہ کے باوجود شغف رکھتا ہے، مذہبی قصّے کہانیاں بیان کرنی شروع کیں۔ یہ کہانیاں یونان کی قدیم تاریخی روایات کا مظہر تھیں اس لئے تائیس نے اُن کو ہمیشہ عقیدت اور احترام کے کانوں سے سُنا ــــ تائیس اور انطون کی گفتگو کا صرف ایک منظر:ــــ

تائیس: سکندرِ اعظم پر ہم یونانی فخر کرتے ہیں۔

انطون :- میں تو کہتا ہوں اس مقدس فاتح اور نامور شہنشاہ کے کارنامے تاریخ انسانیت کے لئے باعث فخر ہیں۔

تائیس :- اس کے باپ کا نام بھی تمہیں معلوم ہے؟

انطون :- (مسکراکر) ہیں کیا یونان کے گاؤں کے بچے تک جانتے ہیں کہ سکندر فیلقوس کا بیٹا تھا

تائیس :- مگر مذہبی تاریخ کچھ اور کہتی ہے۔

انطون :- مذہبی تاریخ کا سکندر اعظم کے باپ کے متعلق کچھ اور فیصلہ ہے کیا؟

تائیس :- بہت سے واقعات غلط طور پر دنیا میں مشہور ہو جاتے ہیں بیٹے!

انطون :- تو فرمایئے! مذہبی کتابوں میں کیا لکھا ہے۔

تائیس :- سنو! وہ دیوتا جو اکثر سانپ کا روپ دھار لیتا ہے۔ سکندر اعظم کی ماں اولمپیاس پر عاشق ہو گیا۔

انطون :- یہ مقدس دیوتا بھی عشقبازی کرتے ہیں۔ اچھا!۔ آپ کیا فرما رہے ہیں۔

تائیس :- عشق تو کائنات کی روح ہے بیٹے! تم نے محبت کو اس قدر مکروہ کیوں سمجھ رکھا ہے؟۔ دیوتاؤں اور دیویوں کی تاریخ تو عشقبازی کے واقعات سے لبریز ہے۔

انطون :- حیرت ہے!

تائیس :- چند دن میں تمہاری یہ حیرت دور ہو جائے گی۔

انطون :- تو پھر کیا ہوا؟

تائیس :- وہی ہوا جو ہونا چاہیئے اور ہوا کرتا ہے۔ اولمپیاس سے بچہ پیدا ہوا جس کا

نام سکندر رکھا گیا۔ سکندر کا باپ فیلقوس نہیں دیوتا تھا۔

انطون :۔ مگر اس راز کا انکشاف کس طرح ہوا؟

تائیس :۔ یہ بھی بتاتا ہوں ——— ایران پر آخری بار حملہ کرنے سے قبل سکندر اعظم جو پیٹر امین دیوتا کی زیارت کے لئے روانہ ہوا صحرائے لیبیا کے مرغزار میں یہ مندر واقع تھا۔ اُس مندر کے ایک بوڑھے اور خدا رسیدہ کاہن نے اس حقیقت کے چہرے سے پردہ اُٹھایا ——!

انطون کے ذہن میں یہ بات بٹھادی گئی کہ مقدس دیوتا بھی عورتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور صنف نازک کی جانب طبیعت کا میلان عصمتِ کردار کو ذرہ برابر متاثر نہیں کرتا۔ عورت محبت کرنے کے لئے خلق کی گئی ہے۔ ایک بار تائیس نے انطون سے کہا :۔

" انطون ! آج میں تمہارے سامنے "ضمیاتِ یونان" کا ایک مقدس ورق پیش کرتا ہوں۔ اس کو مصور کرکے دیوتاؤں کی خوشنودی کا پروانہ حاصل کرلو۔ غور سے سُنو ! اب سے ہزاروں سال پہلے یونان کے مشرقی حصہ میں "اڈانس" نامی نوجوان رہتا تھا۔ یہ نوجوان بہت زیادہ خوبصورت اور صحت مند تھا۔ اُس کے حُسن کی دُور دُور شہرت تھی۔ عشق و محبت کی دیوی اُس پر عاشق ہوگئی۔ اتفاق کی بات کہ ایک جنگلی سوئر نے اڈانس کو زخمی کردیا۔ اپنے محبوب کی یہ حالت دیکھ کر وینس دیوی بیتاب ہوئی اور اُس نے شرابِ آسمانی کے قطرے اُس کے زخموں پر ٹپکا دیئے۔ مگر اڈانس کا وقت آچکا تھا۔ شرابِ آسمانی کے اثر سے بھی وہ جانبر نہ ہوسکا۔ لیکن وہ چند قطرے جو اُس کے زخموں سے ٹپک کر زمین پر گر پڑے تھے اُن سے لالہ و گُل اُگ آئے۔ یہ حُسن و محبت کا فیض ہے

جو زمین گُل ولالہ سے پُر بہار بن گئی ہے۔

انطون اب حسین عورتوں کی تصویریں بنانے لگا۔ عورتوں سے باتیں کرنے اور دیکھنے میں اب وہ دلچسپی محسوس کرتا۔ نائیس اپنا فرض انجام دے چکا تھا۔ انطون کی ماں کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے سالگرہ کے موقع پر انطون کو لڑکیوں کی طرف بھول بھٹکے دیکھا۔ انطون کی شادی کے لئے سلسلہ جنبانی شروع ہو گئی۔ اُس کی ماں بہت خوش تھی کہ اب کوئی دن میں بہو گھر میں آجائے گی۔ اور وہ اپنے پوتے یا پوتی کو گود میں لے کر پیار کیا کرے گی ——— بوڑھی عورت کی یہ تمنا بالکل فطری تھی۔ تمام مائیں یہی چاہتی ہیں اور بہت دن تک اُن کے تصوّرات اُمیدوں کے اسی گہوارے میں جھولتے رہتے ہیں۔

صنفی جذبات کا ساکن دریا جب ایک بار متموج ہو جاتا ہے تو پھر ٹھہرنے کا نام نہیں لیتا۔ لذتوں اور خواہشوں کے حمام میں بڑے بڑے مقدس انسان برہنہ ہو جاتے ہیں۔ لذت کو ہوس بنتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ ہوسناک چٹخارے نظارہ و گفتگو پر قانع نہیں رہ سکتے۔ زندگی رنگینی کی فضا میں ایک بار سانس لینے کے بعد چاہتی ہے کہ رنگینیاں اُس کو جذب کرلیں یا وہ رنگینیوں میں جذب ہو جائے۔ ہوس اپنی کارفرمائیوں پر قلب و ضمیر کو پہلے پہل یہ سمجھا کر دھوکا دیتی ہے کہ یہ "محبت" ہے۔ اور محبت کرنا کوئی گناہ نہیں۔ دل پر قابو پانا کسی طرح ممکن نہیں۔ اور محبت کے شعلے بڑے بڑوں کے دامنِ عصمت کو سوختہ سامان بنا دیتے ہیں۔

انطون بھی زندگی کی اسی منزل سے گزر رہا تھا۔ پہلے پہل تو اُسے دو چار لڑکیوں سے کچھ یوں ہی سی دلچسپی پیدا ہو گئی اور پھر ایک خوبصورت لڑکی سے غیر معمولی تعلقِ خاطر ہو گیا۔ یہ ایتھنز کے ایک تاجر کی لڑکی تھی جسے اُس کے گھر والے انجلی کے نام سے پکارتے

تھے۔ انجلی حسین، شوخ اور سلیقہ مند تھی۔ اُس میں ایک نوجوان مرد کو متوجہ کرنے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ جوانی خود اپنی جگہ فتنۂ روزگار ہے اور حُسن کے ساتھ مِل جُل کر تو یہ فتنہ، قیامت بن جاتا ہے۔

انجلی سے انطون کا پہلے پہل تعارف یہودیوں کے مشہور تیوہار "عید الفصح" میں ہوا۔ اس تقریب پر یہودی غیر معمولی جوشِ مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل کو جو فراعنۂ مصر کی غلامی سے آزادی ملی تھی، یہ "عید" اُسی کی یادگار ہے۔ انجلی اپنے گھر والوں کے ساتھ ایتھنز کے مشہور باغیچے میں سیر و تفریح کے لئے آئی تھی۔ یہودی وہاں رنگ رلیاں کر رہے تھے۔ شراب، رقص، نغمہ، نقل و گزک، ہنسی مذاق، قہقہے! مسلمانوں کے تیوہاروں کے سوا دُنیا کے تمام تیوہاروں پر اسی قسم کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔

انطون کے ساتھ پالتو کُتّا تھا اور انجلی ہرن کا خوبصورت بچّہ ساتھ لے کر آئی تھی۔ انطون کے کُتّے نے انجلی کے ہرن کا تعاقب کیا۔ ہرن دوڑ کر انجلی کے پاس آگیا۔ انطون نے کُتّے کو آواز دے کر جیسے تیسے روکا۔ ہرن کا بچّہ ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

—— آپ اتنے شریر اور خونخوار کُتّے کو اس طرح لئے پھرتے ہیں —— انجلی نے انطون سے کہا۔

—— اور آپ نے ہرن کے بچّہ کو اپنا مصاحب بنالیا ہے۔ جسے دیکھ کر کوئی بھی ہوا کُتّا بھی خاموش نہیں رہ سکتا —— انطون نے جواب دیا۔

—— تو یوں کہئے آپ کا کُتّا بے قصور ہے۔ ساری خطا میری اور ہرن کی ہے —— انجلی قدرے جھنجلا کر بولی۔

—— ارے صاحب! نہ میں قصوروار ہوں اور نہ آپ خطاوار۔ جانوروں کے

پیچھے دو انسانوں کو اپنا دل میلا نہیں کرنا چاہیئے۔ آپ تو دُنیا میں خفا ہونے کے لئے نہیں ہنسنے اور خوش رہنے کے لئے پیدا ہوئی ہیں۔ ـــــ انطون نے کہا۔

ـــــ اور آپ کی پیدائش کی غرض و غایت؟ ـــــ انجلی نے دریافت کیا۔

ـــــ خوبصورت چہروں کو دیکھنا اور کلیجہ تھام کر رہ جانا ـــــ انطون نے جواب دیا۔

ـــــ تو آپ کو ایک دن میں کتنی بار کلیجہ تھامنا پڑتا ہے؟ ـــــ انجلی نے دل رُبایانہ انداز میں پوچھا۔

ـــــ ہر خوبصورت چہرے کو دیکھ کر کلیجہ نہیں تھاما جاتا ـــــ انطون مسکرا کر بولا۔

ـــــ تو وہ کوئی خاص چہرے ہوتے ہیں جن کا نظارہ آپ کو دل تھامنے اور آہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے ـــــ انجلی نے جواب دیا۔

ـــــ جی ہاں! وہ خاص چہرے ہوتے ہیں ـــــ آپ کو معلوم نہیں ہے میں مصوّر بھی ہوں اور مصوّر عام لوگوں کے مقابلہ میں چہرے کے خطوط کو زیادہ پہچانتا ہے۔ آپ اجازت دیں تو کچھ عرض کروں ـــــ انطون نے سادگی کے ساتھ کہا۔

ـــــ آپ تو بڑے دل چسپ معلوم ہوتے ہیں! ہاں صاحب فرمائیے تو۔ ـــــ انجلی نے کہا۔

ـــــ آپ کے چہرے میں وہ تمام جاذبیتیں اور دل کشیاں موجود ہیں جن کو مصوّر کی نگاہیں ڈھونڈھتی رہتی ہیں اور نظارہ جن پر ناز کرتا ہے ـــــ انطون نے انجلی کو غور سے دیکھ کر جواب دیا۔

ـــــ آپ کو بنانا تو خوب آتا ہے۔ میرے چہرے میں ایسی کیا بات ہے؟ شبنم جیسا

رنگ، بے رونق چہرہ، اُبھری ہوئی ٹھوڑی، اتنا لانبا قد ـــــ انجلی نے اس انکسار کے ساتھ کہا کہ وہ انطون سے اپنی خوبصورتی کی مفصّل تعریف سُننا چاہتی ہے۔

ـــ آپ کا رنگ ـــ دیکھئے! گلاب کے پھولوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ آپ کا چہرہ تو شادابیوں اور جاذبیتوں کی قوس قزح ہے اور قد ـــــ غیرت سرو و شمشاد! صنوبر کی شاخ اتنی لچکیلی نہیں ہوتی ـــ آنکھیں مینا نہ در آغوش! ۔ پہلی ملاقات میں اس سے زیادہ تفصیل میں جانے کی جُرأت نہیں کر سکتا ـــــ انطون کے تحسین آمیز جملوں نے لڑکی کے چہرے کی سُرخی میں اور اضافہ کر دیا۔ دونوں پہلی ملاقات ہی میں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ گئے۔ آج کا تعارف کلام و گفتگو تک محدود تھا مگر دونوں کی نگاہیں کہہ رہی تھیں بلکہ پیش گوئی کر رہی تھیں کہ دو چار ملاقاتوں میں بے تکلفی ہو جائے گی۔ دو جوان دلوں کا تصادم قیامت ہوتا ہے۔ بڑی سے بڑی رُکاوٹ بھی اس قیامت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

انجلی اور انطون کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آج اس باغ میں، کل اُس باغیچہ میں، کبھی دریا کے کنارے۔ کبھی کسی تماشا گاہ میں! ہوس لذّتوں کے سہارے نشو و نما پانے لگی۔ آزادانہ طور پر ملاقات کا ہر وقت موقع حاصل تھا۔ رُکاوٹیں اور پابندیاں ایسی باتوں کی پھر کچھ روک تھام کرتی ہیں۔ یہاں سہولت ہی سہولت اور آسانی ہی آسانی تھی۔ انطون نے اپنے شوق و محبت کا اظہار اس طرح کیا کہ انجلی کی ایک تصویر بنائی ـــــ تصویر۔ ..... نہیں۔ نہیں۔ فنِ مصوری کا معجزہ ـــــ مقدس دیوتاؤں کی تصویر کشی میں بھی اُس نے اس قدر دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پیر کے ناخنوں سے لے کر سر کے بالوں تک ہر عضو کو کاغذ پر مجسم کر دیا تھا۔ انجلی واقعی حسین اور جاذبِ نظر

تھی مگر انطون کے شوقِ فراواں اور حسنِ انتخاب نے تصویر کو اور زیادہ حسین بنا دیا مصوّر اچھی تصویر اُسی وقت کھینچ سکتا ہے کہ یا تو روپیہ پیسہ کا لالچ ہو یا پھر تصویر کھچوانے والے سے وہ ذاتی طور پر دلچسپی رکھتا ہو۔ ذاتی دلچسپی اُجرت کے تصوّر سے زیادہ وزنی ہوتی ہے۔ جس طرح اچھے شعر کی تعریف یہ ہے کہ وہ کہا نہیں جاتا خود بخود ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اچھی تصویر بنائی نہیں جاتی آپ ہی آپ بن جاتی ہے۔ بظاہر مصوّر کا دماغ اور موئے قلم مصروفِ جنبش نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں اُس کا دل حرکت میں ہوتا ہے۔ وہ جو کسی واقفِ راز اور صاحبِ نظر نے کہا ہے :-

"حُسن سمٹ کر چُپ چاپ کھڑا ہو جاتا ہے تو مجسّمہ کہلاتا ہے اور جب حرکت اور رقص کرنے لگتا ہے تو شعر نام پاتا ہے"

تو انطون نے ایسی تصویر بنائی تھی کہ وہ شعر کی طرح رقص کرتی تھی۔ اُس نے بہ یک وقت شاعری بھی کی تھی اور مصوّری بھی! لوگ تصویر دیکھ کر بے ساختہ پکار اُٹھتے کہ یونان میں بھی ایک مانی پیدا ہو گیا۔ اور اس شہرۂ آفاق ایرانی مصوّر کے مرقعوں کی بیاض "ارژنگِ مانی" میں یونان کے اس جواں سال مصوّر کی یہ تصویر شامل کی جا سکتی ہے۔

انجلی کے گھر والے شراب کے رسیا تھے۔ اُن سے بے تکلفی بڑھانے اور اُس سوسائٹی میں شامل ہونے کے لئے انطون کو بھی اس آگ کو پانی کر کے پینا پڑا۔ انطون —— فلسفی انطون —— جو افلاطون کے فلسفۂ نیکی کا دلدادہ تھا اب شرابی بن گیا تھا۔ اور ایک آوارہ جوان لڑکی اُس کی دوست تھی۔ انجلی کی

تصویر اُس کے شوق اور فنی قابلیت کا آخری مظاہرہ تھا۔ اوّل تو عیش و عشرت میں فرصت کی ساعتیں ہی بہت کم میسّر آتی تھیں۔ کُنج چمن، سبزہ زار، شراب کا دَور اور خوبصورت لڑکی کا زانو! کبھی اُس کی زلفوں کے سایے میں شراب پی لی اور کبھی وہ انجلی کے زانو پر لیٹ گیا اور اُس نے جامِ مَے اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ انطوَن کو اپنی قسمت پر رشک آتا تھا کہ اس قدر حسین و خوب رُوساتی مقدّر والوں ہی کو ملتا ہے۔ دن میں نہ جانے کتنی بار بزمِ جمشید برپا ہوتی۔ اور دونوں لذّتوں میں غرق ہو جاتے۔

دوسری بات یہ تھی کہ شراب اور اُس کے لوازم آدمی کو راحت طلب بنا دیتے ہیں، دماغ میں اُپج کا مادّہ باقی نہیں رہتا۔ انہی راحت پسندیوں اور رنگینیوں کے باعث انطوَن تصویرکشی کی طرف سے بے پروائی برتنے لگا۔ کسی کی تصویر بنانے بیٹھتا تو جی انجلی میں پڑا رہتا۔ کاغذ پر لکیریں کھینچ رہا ہے اور دماغ انجلی کی نرم و سیاہ زلفوں کے پیچوں سے کھیل رہا ہے۔ اُس نے بہت سی تصویریں تو نا تمام حالت میں چھوڑ دیں اور جو کھینچیں وہ بہت ہی گھٹیا درجہ کی تھیں عیش و عشرت نے اُس کے آرٹ کو تباہ کر دیا۔ ہوسناک تعلقات بہت دن تک نہیں چل سکتے۔ چند دن میں طبیعت سیر ہو جاتی ہے اور پہلی سی دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ ہوس کی زندگی پانی کے بلبلے کی طرح ہوتی ہے۔ کہ سطحِ آب پر یکایک نمودار ہوا اور ٹوٹ گیا۔ جذبات کی گرمی بے تکلّفی کے چند دوروں ہی میں ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اور دل کوئی دوسرا محاذ ڈھونڈھنے لگتا ہے۔ ایتھنز میں جوان اور خوبصورت لڑکوں اور لڑکیوں کی کمی نہ تھی۔ چند دن کے بعد وہ انطون

جو دوسری لڑکی کی طرف آنکھ بھر کر دیکھتا بھی نہ تھا۔ اب شوق و دلچسپی کے ساتھ اُن سے ملنے لگا۔ اس شوق میں بے تکلفی اور بے اعتدالی شامل نہ تھی۔ مگر ہر دلچسپی آگے چل کر غیر معتدل اور بے راہ روبن سکتی ہے۔ غیر غور توں سی خلا ملا اور ربط ضبط کا مقصد یہی یہ ہوتا ہے کہ طبیعت میں چہل پہل پیدا ہو چکی ہے۔ اور جذبات کسی اور طرف لئے جا رہے ہیں۔

انجلی بھی اس منزل میں انتطون سے پیچھے رہنے والی نہ تھی، انتطون کی طرح اُس کے بھی بہت سے شیدائی تھے اور بہت سی نگاہیں بلکہ آغوشیں اُس کی پذیرائی کے لئے تیار تھیں۔ ہوس یک درگیر و محکم گیر کا پابند ہو کر رہ ہی نہیں سکتی۔ ——— وہاں تو۔۔۔ ———

نظریں نئی نئی ہوں اشارے نئے نئے
دل ڈھونڈتا ہو روز سہارے نئے نئے

پر عمل کیا جاتا ہے۔ لذت میں تنوع اور نیا پن نہ ہو تو "لذت" میں ربودگی اور فرسودگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہوس اپنی دست درازیوں کے محاذ بدلتی رہتی ہے۔ ہوس پرست اگر بہت دن تک ایک ہی منزل پر گام زن نظر آئے تو سمجھ لو کہ اُسے موقع ہی نہیں ملا۔ اور حالات نے مساعدت نہیں کی ——— انجلی بھی دوسرے نوجوانوں سے بے تکلف ہو کر ملنے لگی۔ اُس کی بے تکلفی حیرت انگیز نہ تھی۔ اس لئے کہ جو لڑکی ایک بالکل اجنبی شخص سے پہلی ملاقات میں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کر سکتی ہے اور اپنی خوبصورتی کی تعریف سُن کر اُس کے کانوں میں رس پڑتا ہے تو ہر نوجوان جو ذرا خوشرو ہوگا اور اُس کے حُسن کی تعریف کرے گا اُس کو وہ ناپسند

کر ہی نہیں سکتی۔

انطون اپنی حماقت سے یہ سمجھتا تھا کہ انجلی کی بزمِ خیال و عمل اُس کے سوا تصورِ غیر سے خالی ہے اور اُس کی آوارہ مزاجی اور دوسری لڑکیوں سے بے تکلفی کے باوجود وہ بس اُسی کی ہو کر رہے گی۔ اور کسی اور کی جانب مائل نہ ہوگی۔ انطون کا خیال تھا کہ وہ انجلی کے نگاہ و دل اور جذبات و تصورات کو خرید چکا ہے۔ اور خریدی ہوئی چیز مالک کی مرضی کے بغیر دوسرے کی ہو ہی نہیں سکتی ——— یہ اُس کی نادانی اور غلط اندیشی تھی۔ اوّل تو فطرتِ ہوس خریدے جانے کے بعد بھی خریدار کی ہو کر نہیں رہ سکتی۔ غدّاری، بے وفائی اور خیانت اُس کی خاصیت ہے۔ اور اگر وہ بے وفائی نہ بھی کرے تو کیا خریدی ہوئی چیز کی چوری نہیں ہو سکتی۔

انطون نے دو چار محفلوں میں انجلی کو دوسرے نوجوانوں کے ساتھ ہنستے ہوئے دیکھ کر ٹوکا تو انجلی بولی کہ آپ بھی تو دوسری لڑکیوں سے بات چیت کرتے ہیں، ہنستے بولتے ہیں۔ اگر آپ کی نیّت میں کوئی فساد نہیں ہے تو پھر میری طبیعت کو بھی صاف سمجھئے! انطون جھلا کر خاموش تو ہو گیا مگر اُس دن سے وہ انجلی سے کھٹکنے لگا۔ کسی غیر مرد سے وہ باتیں کرتی تو انطون بہت غور سے دیکھتا کہ انجلی نے کس انداز سے گفتگو کی۔ کون سے لفظ پر زور دیا۔ کس جگہ مسکرائی! بات کرتے میں اُس کی آنکھوں کا انداز کیا تھا۔ اور مرد کے چلے جانے کے بعد اُس کے چہرے پہ کیا عالم طاری رہا۔ ہوسناکی کے اس دور میں بھی انطون میں غیرتِ رقابت باقی تھی۔ اور یہی جذبہ اُسے رہ رہ کر بے چین کرتا تھا۔

انطون فلسفہ کا طالب علم تھا۔ اور فلسفی نفسیاتِ انسانی کو اچھی طرح جانتا ہے

مگر علم النفس ظاہری علامتوں کو دیکھ کر فتوے لگا سکتا ہے کہ فلاں شخص اس وقت فلاں ذہنی کش مکش میں مبتلا ہے - باطنی کیفیات کا سمجھنا قریب قریب ناممکن ہے - بہت سے لوگ چہرے سے متضاد کیفیتیں ظاہر کر سکتے ہیں - یعنی چہرہ غمگین ہو اور دل شادماں یا دل پر چھریاں چل رہی ہوں اور چہرہ مسکرا رہا ہو - پیشہ ور مجرم تیوروں پر انتہائی معصومیت اور مظلومیت طاری کر لیتے ہیں جیسے ان بے چاروں نے کچھ نہیں کیا اور یہ بلا وجہ دھر لئے گئے ہیں -

انطون ایک دن انجلی کے مکان میں داخل ہوا تو ایک نوجوان کو وہاں سے نکلتے دیکھ کر اُس کا ماتھا ٹھنکا کہ ہو نہ ہو یہ انجلی کا کوئی دوست یا جان پہچان کا آدمی ہے - انجلی غسل خانے میں نہا رہی تھی - اُس نے ماما سے دریافت کیا، ماما نے کہا کہ یہ تو ایک مہینہ سے اکثر یہاں آتے رہتے ہیں - انجلی کل اِن کے ساتھ دریا کی سیر کو گئی تھیں - یہ صاحب آج کوئی تحفہ بھی لے کر آئے تھے - تھوڑی دیر میں انجلی نہا دھو کر کمرے میں آگئی اور نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ انطون سے ملی! انطون انتہائی ضبط سے کام لے کر مسکرایا اگرچہ اُس کے سینے میں بھٹی سُلگ رہی تھی - انجلی کے آبنوسی قبچے پر پوتھ اور سیپ کا ہار رکھا تھا - انطون نے دریافت کیا کہ یہ ہار کہاں سے آیا؟ - انجلی نے قدرے جھجک کر جواب دیا کہ میرے پاپا خرید کر لائے تھے - اِس پر انطون بولا میں تمہارے پاپا سے آج مل کر کہوں گا کہ میری بہن کے لئے بھی اسی قسم کا ہار مول منگوا دیں - انجلی نے کچھ سوچ کر جواب دیا ”مگر یہ ہار اُنہوں نے کسی اور سے منگوایا تھا اور ابھی تک تو انہیں اس ہار کی خبر بھی نہیں ہے -

”یہ ہار تمہارے پاپا نے کب منگوایا تھا“ انطون نے دریافت کیا -

—"کل شام" —— انجلی نے جواب دیا۔

—"اور ابھی تمہارے مکان میں یہ نوجوان کون آیا تھا؟" —— انطون نے پوچھا۔

—"جی۔۔۔ نوجوان۔۔۔۔ ہاں! ہاں! وہ تو —— اور۔۔۔"

انجلی بات بنانے کے لئے تتلانے لگی اور انطون نے اس پر کہا:۔

—"انجلی! میں آخری بار تم کو آگاہ کرتا ہوں کہ تمہارا یہ رویہ مجھے ناپسند ہے۔ دیکھو! میری غیرت کو خدا کے لئے چیلنج نہ دو! جوان مرد کی غیرت بہت طوفانی اور خوفناک ہوتی ہے۔ انجلی! تم ناسمجھ نہیں ہو۔ بس یہ چند جملے جو عقلمند کے لئے ننانوے دفتروں کی برابر ہیں تمہارے لئے بہت کافی ہیں۔"

انطون نے اس قدر خوفناک تیوروں کے ساتھ آج باتیں کیں کہ انجلی خوف زدہ ہو گئی۔ اُس کا دل کہہ رہا تھا کہ انطون کو اب ذرا سا شُبہ بھی کسی خطرناک اقدام پر آمادہ کر سکتا ہے۔ انطون کی موجودگی میں اب میری زندگی ہر وقت خطرے میں ہے۔ شہر میں خوں ریز رقابتوں کے حادثات ظہور میں آتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ نئے تعلقات کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں۔ لیکن انطون کا دل میری طرف سے مشکوک ہو چکا ہے اور مشکوک آدمی کا کوئی اعتبار نہیں نہ جانے وہ کس وقت کس بات پر بگڑ بیٹھے!

انجلی نے اپنے نئے آشنا سے ذکر کیا اور دونوں شدید خطرہ محسوس کرنے لگے۔ انطون غیرت کے آتشیں ہتھیاروں سے کھیلنا چاہتا تھا۔ ادھر انجلی اور اُس کا دوست مکر و فریب کی آڑ میں غیرت و انتقام کی اُس شمع زندہ کو گُل کر دینے کی فکر میں تھے۔ ہوسناکی نے

خوں ریز اسکیم مرتب کرلی ـــــــ انجلی نے چند روز بہت ہی احتیاط سے کام لو
انطوآن کو فریب دینے اور تاریکی میں رکھنے کے لئے! ایک دن شہر سے باہر ایک باغ
میں انجلی نے انطوآن کو شراب پلائی اور اُس کے انکار کرنے پر بھی شراب پلائی چلی گئی۔
ـــــ پیاری انجلی! بس کرو۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے ـــــ انطوآن
نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔
ـــــ نہیں پیارے! میری خاطر ایک پیالہ اور ـــــ پھر تم آرام سے سوتے
رہنا ـــــ انجلی نے جواب دیا۔ اور آخری پیالہ کی جگہ پے در پے کئی جام
پلا دیئے۔ آج کی شراب بھی تیز تھی۔ انطوآن بے ہوش ہو گیا۔ اس کی نبض زور
زور سے چل رہی تھی۔ اتنے میں انجلی نے شراب کا پیالہ زمین پر دے مارا اور
اُس کا دوست اس آواز اور مقررہ اشارے پر پودوں کی اوٹ سے نکل کر آگیا۔
اور آتے ہی انطوآن کی فصدیں کھول دیں۔ اور دونوں وہاں سے غائب ہو گئے۔
انطوآن کی شراب زدہ رگوں سے اتنا خون ٹپکا کہ اُس نے تڑپ تڑپ کر جان
دے دی ـــــ انطوآن کی ماں کو بہو دیکھنے کی تمنا تھی لیکن بہو تو نہ آسکی
جوان بیٹے کا جنازہ گھر میں رکھا تھا ـــــ ماتا ماتم کر رہی تھی جسے
سُنکر لوگوں کا سینہ پھٹا جا رہا تھا ـــــ!

ـــــ ۱۹۶۶ء ـــــ

پیر قلنچ

خمیدہ ناک - پچکے ہوئے گال، پستہ قد - کرنجی آنکھیں - پر قلنچ ڈاڑھی گھٹا ہوا سر ——— اس حُلیہ کے آدمی کو دیکھ کر کون مردِ معقول ہنسی ضبط کر سکتا ہے - اِلّا یہ کہ کوئی آدمی ہنسنا ہی نہ جانتا ہو مگر اربابِ منطق نے انسان کی تعریف ہی کی ہے کہ وہ رشیق القامت اور ضاحک ہوتا ہے - یعنی دوسرے جاندار انسان کی طرح نہ تو سیدھے قد کے ہوتے ہیں اور نہ وہ ہنسنا جانتے ہیں ہنسی انسان کو دوسرے جانداروں سے ممتاز بناتی ہے - ہنسنا انسان کی طبعی خاصیت ہے - اس لئے شیخ شریف الدین کو دیکھ کر سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی ہنس دیتا یا کم سے کم مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر ناچنے لگتی - اس حُلیہ پر شیخ جی کا لباس اور زیادہ مضحکہ خیز اور تبسّم آور تھا اور جاڑے کے زمانہ میں تو وہ اچھّا خاصا کارٹون نظر آتے تھے ——— روئی کا پاجامہ جو عموماً رنگین ہوتا تھا - خوب ڈھیلا ڈھالا فرغل، روئی کا کنٹوپ جس کا ایک ایک بند فٹ فٹ بھر کا تھا اور اس پر جھوتے کام کا پھول دار جوتہ - شیخ جی جس گلی سے گذرتے تھے :-

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

کا سماں بندھ جاتا۔ شیخ جی تمام شہر میں مشہور اور اپنی سادہ لوحی اور حماقت کے سبب مقبول خاص و عام تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے شیخ جی کی باتوں سے لطف اٹھاتے اور اُن سے مذاق کرتے۔ شیخ جی کی صورت اور سیرت میں ذرّہ برابر اختلاف اور تفاوت نہ تھا۔ جیسی صورت ٹھیک اسی انداز کی سیرت یا یوں کہئے کہ جیسی روح ویسے فرشتے! حماقت اُن کے کردار، طینت، فطرت اور عادت میں گھُل مل گئی تھی ——— یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ شیخ جی فطرۃً بے وقوف واقع ہوئے تھے یا زندگی کے واقعات اور زمانہ کے حالات نے اُن کو ایسا بنا دیا تھا؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی کے حادثات آدمی میں بہت کچھ تبدیلیاں پیدا کر دیتے ہیں۔ ہم نے بہت سے آدمیوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنی ابتدائی زندگی میں انتہائی صابر و ضابط اور سنجیدہ مزاج تھے لیکن پیہم صدمات او حادثات نے اُن کو چڑچڑا اور تنک مزاج بنا دیا اُن کی طبیعت کے خلاف ذرا سی بات ظہور میں آئی اور وہ بگڑ بیٹھے۔ اسی طرح حوادث مزاجی کیفیات کو تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ یہ تمام حقائق اپنی جگہ مسلم اور درست ہیں۔ زمانے کے حادثات ایک اچھّے خاصے آدمی کو دیوانہ تک بنا سکتے ہیں مگر بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ بے وقوفی اور حماقت، دانائی اور فراست کی سطح حوادثِ روزگار، واقعات زندگی اور انقلابات زمانہ سے بہت بلند ہے، تو ہمارے شیخ جی کو بھی حالات و واقعات نے حماقت زدہ

اور سادہ لوح نہیں بنایا۔ اُن کو قدرت نے شاید اس انداز پر اسی لئے پیدا کیا تھا کہ لوگ اُن کی صورت، سیرت، طور وطریق۔ انداز گفتگو اور چال ڈھال سے لطف اور تفریح حاصل کریں ——— تو کیا قدرت ظالم اور غیر عادل ہے؟ کہ دوسروں کی اچھی صورتیں بنائیں اور اُن کو عقل و فراست عطا فرمائی۔ سنجیدگی اور متانت کی دولت سے نوازا۔ اور ہمارے شیخ جی کو سر تا بہ قدم اور دل تا بہ نگاہ بے وقوف اور مضحک بنا دیا ——— یہ ظلم نہیں قدرت کی عنایت ہے! اسرار قدرت ہر کس و ناکس کی سمجھ میں نہیں آتے۔ آدمی امورِ قدرت پر تنقید کرتے وقت تصویر کے دونوں رُخ نہیں دیکھتا۔ اسی لئے نظام قدرت پر انسانوں نے جب بھی اعتراض کیا اور آئین تخلیق پر تنقید کی ٹھوکر کھائی اور شدید غلطی کا ارتکاب کیا۔

ہمارے شیخ جی اگر سادہ لوح نہ ہوتے تو اُن کو اتنی شہرت کس طرح حاصل ہوتی۔ شہروں میں مالدار لوگ ہزاروں لاکھوں روپے پُن اور خیرات میں دیتے ہیں۔ دھرم شالائیں بنوائی جاتی ہیں، سڑکیں تعمیر ہوتی ہیں، یتیم خانے تیار ہوتے ہیں۔ لائبریریاں قائم ہوتی ہیں ——— یہ سب کس لئے ہوتا ہے؟ شہرت و نمود کے لئے! اخباروں میں جلی عنوانات اور تصویروں کے ساتھ خبریں شائع ہوتی ہیں کہ فلاں سیٹھ جی اور خان بہادر نے اتنی بھاری رقم قومی چندے اور رفاہِ عام کے لئے عنایت فرمائی۔ انجمنوں کی طرف سے چندہ دینے والوں کا شکریہ ادا ہوتا ہے۔ اُن کی خدمت میں سپاس نامے پیش کئے جاتے ہیں، شعراء مدحیہ قصائد لکھتے ہیں۔ یہ تمام باتیں اس امر کی شاہد ہیں

کہ یہ سب کچھ مشہور ہونے کی خاطر اور عوام میں مقبول ہونے کی غرض سے کیا جاتا ہے۔ دُنیا میں کتنے لوگ ایسے نکلیں گے جو رفاہِ عام کے لئے چندہ دے کر گمنام رہنا پسند کریں۔ اور اپنی شہرت نہ چاہیں۔ یہ تمام مالی قربانیاں جذبۂ شہرت کو تسکین دینے کے لئے کی جاتی ہیں ـــــــ اور شیخ جی کو کسی قربانی کے بغیر ہی شہرت حاصل ہوگئی ـــــــ تو اب بتائیے کہ اُن کی سادہ لوحی قدرت کا ظلم ٹھہری یا نوازش؟

دعوتوں اور تقریبوں میں تفریحی پروگراموں کے لئے گنجائش پیدا کی جاتی ہے اور ہمارے شیخ جی اپنی جگہ مُجسّم بلکہ زندہ دیوارِ قہقہہ تھے۔ یا یوں سمجھئے کہ قدرت نے اُن کے وجود کو زعفران کے کھیتوں کا برزخ بنا دیا تھا کہ دیکھئے اور بس ہنستے ہی رہئے اس لئے شیخ جی شہر کی دعوتوں، جلسوں اور پارٹیوں میں بُلائے جاتے۔ اُن کی ذات دلچسپی اور تفریح کا مرکز بلکہ کھلونا تھی ـــــــ ایسا عجیب و غریب کھلونا جس سے بچے، جوان اور بوڑھے بقدرِ ذوق لطف حاصل کرتے اور جی بہلاتے۔ شیخ جی خوش خوراک بھی واقع ہوئے تھے۔ اور معدہ بھی خدا کے فضل سے نہایت عریض و طویل پایا تھا، اس لئے کہیں ان کو نہ بھی بلایا جاتا تو بھی وہاں وہ اپنے گھٹے ہوئے سر اور بے ترتیب ڈاڑھی کو لے کر پہنچ جاتے۔ اُن کا اس طرح بن بلائے نازل ہو جانا کسی کو ناگوار نہ گزرتا۔ بڑی دعوتوں میں ایک دو آدمی کے بڑھ جانے سے کوئی کمی نہیں آجاتی۔

شیخ جی دعوتوں میں بلائے جانے کے ڈھنگ سے اچھی طرح واقف تھے اُن کو خبر ہو جاتی ـــــــ اور دعوتوں کی خبر اُن کو ہو کر رہتی ـــــــ کہ فلاں جگہ دعوت ہے تو وہ دعوت کے دن سے دو چار دن پہلے تک تو بے صبری

کے ساتھ انتظار کرتے کہ اب بُلاوا آتا ہے اب طلبی ہوتی ہے۔ جب دیکھتے کہ اُدھر سے کسی نے نہیں بُلایا۔ تو دعوت والے کے یہاں از خود پہنچتے اور کہتے :۔

—— ارے میاں! انتظام کے لئے یہ خاکسار حاضر ہے، جس کام کی ضرورت ہو مجھ سے بے تکلف فرما دیجئے! اور ہاں بھائی! آج کل شہر میں بیاہ شادیوں کی بھرمار ہے، باورچیوں کو بیعانہ دیکر پہلے سے معاملہ طے کرلینا، ایسا نہ ہو آپ وقت کے وقت کہیں اور اُدھر سے ٹال مٹول کی جائے۔ چاندنیاں آگئیں؟ قالین منگوائیے؟ برتنوں کے لئے کہہ دیا گیا؟ گیس کے ہنڈوں کا انتظام ہو گیا؟

اس قدر مخلصانہ اور ہمدردانہ استفسارات کے جواب میں ایک شریف آدمی اس کے سوا اور کہہ ہی کیا سکتا تھا کہ قبلہ شیخ جی! آپ دعوت میں ضرور شرکت فرمائیں۔ میں آپ کے پاس بُلاوا بھیجنا بھول گیا۔ میں شرمندہ ہوں۔

اس کے جواب میں شیخ جی خوش ہو کر گُل افشانی فرماتے :۔

" بھائی! تم نہ بُلاتے تو بھی میں تمہارے گھر کی دعوت میں سر کے بل آتا۔ تمہارے گھر کو تو میں خدا کی قسم اپنا گھر سمجھتا ہوں۔ میرے نانا اور تمہارے دادا مرحوم دونوں لنگوٹیا یار تھے۔ ایسی دوستی اور بھائی چارہ دیکھا نہ سُنا تو بھیا! اس رشتہ سے ہم اور تم بھائی بھائی ہوئے۔ اور بھائیوں میں تکلف ہوا نہیں کرتا۔"

دعوت چکّا کرکے وہ گھر واپس ہوتے اور بیوی سے غرور آمیز لہجے میں کہتے :۔

" سُنا تم نے! خان بہادر صاحب کے یہاں ہماری پرسوں دعوت ہے۔

بڑے شریف اور ملنسار آدمی ہیں، بازار میں جب مجھے جاتا دیکھ کر بگھی سے اُتر پڑے اور میرا ہاتھ تھام کر بولے۔ شیخ جی! میرے لڑکے کا ولیمہ ہے تمہیں ضرور آنا ہوگا۔ تم نہ آئے تو ساری عمر شکایت رہے گی۔ اور ہاں بھیا! ذرا پہلے سے آجانا۔ انتظام کی دیکھ بھال کر لینا۔ ہمارے یہاں کے نوکر اور گھر کے آدمی تو اُول جلول ہیں۔"

بیوی اس پر کہتی ہے۔

"میں نے تو آج تک کسی دعوت والے کو تمہارے گھر پر آتے نہیں دیکھا۔ دو چار سقوں، بھٹیاروں اور جھنگی کے منشیوں کے یہاں سے البتہ بلاوا آیا آیا تھا۔ اور تمہارا یہ عالم ہے کہ ہفتہ میں دو چار وقت مشکل سے گھر کا کھانا کھاتے ہوگے۔ باقی تمام دن دعوتوں ہی میں گزرتے ہیں۔ ہمارے پڑوس میں تم سے زیادہ حیثیت اور عزت کے آدمی رہتے ہیں۔ جن کے گھروں پر ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے مگر اُن کی اتنی دعوتیں نہیں ہوتیں۔ میں بہت دن سے ضبط کر رہی ہوں۔ مگر آج بات نکلی ہے تو میں کہہ کر رہوں گی ______ محلے کی کتنی عورتیں تو کہہ چکی ہیں کہ تمہارے میاں دعوتوں میں بن بلائے پہنچ جاتے ہیں۔ یقین جانو! وہ زبان سے کہہ رہی تھیں اور میں غیرت کے مارے پسینہ پسینہ ہوئی جاتی تھی۔"

شیخ جی بیوی پر برس ہی تو پڑے، فرمایا۔

"اچھا! تو ہم بے غیرت اور جھوٹے ہیں اور وہ خرافہ عورتیں سچی ہیں۔ تم نے اُن عورتوں کے منہ پر جھکینی، گرم توا اور جلتی لکڑی کھینچ کر نہیں ماری کہ وہ ایسی باتیں کر کے میاں بیوی کے دلوں میں فرق ڈالنا چاہتی ہیں۔ بیگم ہم اُن لوگوں

رہے ہیں ؎

س غدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بے بُلائے ہوئے

اِن تمہارے لکھ پتی پڑوسیوں اور موٹر نشین ہمسایوں کو کون پوچھتا ہے ۔ روپیہ، پیسہ، کوٹھی، موٹر، اور اُجلے کپڑوں سے آدمی کی عزت نہیں ہوتی ۔ ہم جس گلی اور کوچے سے نکل جائیں لوگوں کی اُنگلیاں اُٹھنے لگیں کہ شیخ جی آرہے ہیں! تھانہ کے سپاہی سے لے کر بڑے بڑے افسروں تک سب ہمیں جانتے پہچانتے ہیں ۔ اللہ نے مال و دولت نہیں دیا تو کیا ہے عزت تو دے رکھی ہے! یہ تو قدرت کی تقسیم ہے، کسی کو عزت دی اور کسی کو دولت عطا فرما دی ۔"

بیوی، شیخ جی کے ان ارشاداتِ گرامی پر خاموش ہوگئی ۔ جواب دیتی تو شیخ جی کو تاؤ آجاتا ۔ اور ہندوستان کی شریف بیویاں شوہروں کی خفگیِ بے سبب اور عتابِ بے بنیاد سے بہت ڈرتی ہیں ۔ شوہر غصہ کے وقت اپنی برتری، حاکمیت اور قوامیت کا پورا پورا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ شیخ جی کی بیوی شوہر کی اُفتادِ طبع سے اچھی طرح واقف تھی اُن کی حماقت اور سادہ لوحی سے اُس کو ہر وقت سابقہ پڑتا ۔ اُسے معلوم تھا اور اچھی طرح معلوم تھا کہ شیخ جی اپنی حماقت کے سبب لوگوں کا آلۂ تفریح اور کھلونا بن گئے ہیں ۔ مگر وہ شیخ جی پر اس خیال کو ظاہر کرتی تو شیخ جی نہ جانے کیا کیا قیامت بپا کر دیتے! بے وقوف کا غصہ، عقلمند کے عتاب سے بہت زیادہ خطرناک ہوتا ہے ۔ عقلمند کو دلیلوں کے ذریعے قائل اور ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے ۔ مگر بے وقوف دلیلیں سُن کر اور بپھرتا ہے ۔ بیویوں کو شوہروں کی بے اعتدالیوں کے بہت سے تلخ جام گوارا کرنا پڑتے ہیں ۔ شوہر کو بیوی کی شکل

صورت، بات چیت، رنگ ڈھنگ میں سے کوئی بات بھی ناپسند ہوتی ہے تو وہ پھٹ سے منھ پر کہہ دیتا ہے۔ مگر بیوی ایسا قیامت تک نہیں کر سکتی۔ وہ بدصورت سے بدصورت اور بے ڈھنگے سے بے ڈھنگے شوہر کی بھی تعریف ہی کرے گی یا کم سے کم خاموش رہے گی۔ ——— بیوی کی اس ضبط و خموشی کو دنیا شرافت، نیکی اور عصمت و وفا سے تعبیر کرتی ہے۔ اور صنفِ نازک کی بہت سی زندگیاں عصمت و وفا کے اس آتشین امتحانوں میں جھلس کر ختم ہو جاتی ہیں ——— شیخ جی کی بیوی بھی اسی دور سے گزر رہی تھی۔

شیخ جی کو دعوتوں میں نہ بلائے جانے کا چسکا پڑ گیا تھا۔ اس لئے وہ لوگوں پر یہ ظاہر کرتے کہ میں بہت خوش خوراک ہوں۔ میرے گھر خود اچھے کھانے پکتے ہیں۔ اور جب تک پیالے میں چار چار انگل تار نہ کھڑا ہو میں نوالہ نہیں توڑتا ——— مگر یہ تو عقلمندوں کی باتیں ہوئیں اور شیخ جی تو بے وقوف اور سادہ لوح تھے ——— سادہ لوح اور بے وقوف آدمی اپنے فائدے سے غافل نہیں ہوتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ غیر شعوری طور پر وہ کوئی ایسی نادانی کی بات کر بیٹھے کہ جس سے اُس کا نقصان ہو جائے۔ مگر وہ جان کر ایسا نہیں کرتا۔ بہت سی حماقتیں تو نفع بخش اور فائدہ مند ثابت ہوتی ہیں۔ ہمارے شیخ جی کی حماقت بھی ایک طرح سے اُن کے لئے مفید ہی تھی۔ اسی حماقت کی بدولت غرض دعوتیں کھانے کو ملتیں۔ بڑی سے بڑی محفل میں وہ پہنچ جاتے۔ ہر شخص سے بے تکلفی ہو جاتی۔ سارے شہر میں اُن کی شہرت تھی اور چھوٹے بڑے، غریب امیر، سبھی اُن کو جانتے تھے ——— ہاں تو ہم شیخ جی کی خوش خوراکی اور اُس کے اظہار و اعلان کا ذکر کر رہے تھے۔

راستہ میں کسی نے پوچھا، شیخ جی کہاں جا رہے ہو؟ اس کے جواب میں فرمانے
لگے: بھیا! دواخانہ جا رہا ہوں۔ رات زردہ کے چاول ذرا سخت رہ گئے
تھے، پیٹ میں درد ہو گیا۔ آگے چل کر کوئی مل گیا تو اسے دیکھ کر از خود کہنے
لگے: میاں! ہمارا شہر تو قصبوں اور گاؤں سے بدتر ہے۔ صبح سے تلاش
کرتے کرتے یہ وقت ہو گیا مگر دو چار بٹیریں اور تیتر تک نہیں ملے! میں بیوی سے
کہہ کر گھر سے نکلا تھا کہ بٹیریں یا تیتر لے کر آؤں گا تم مسالہ پیس کر رکھنا ——
—— کسی محفل میں ذکر ہو رہا ہے سیاست کا اور شیخ جی بیچ میں بول پڑے
ارے صاحب! ہندوستانیوں نے کونسلوں اور اسمبلیوں میں جا کر کیا کر لیا ہے
جو آزاد ہو کر تیر چلائیں گے۔ جب سے ہندوستانی لوگ وزیر ہوئے ہیں بناسپتی
گھی بننے لگا ہے۔ مگر میں تو بناسپتی گھی کو زہر سمجھتا ہوں۔ کل بیوی نے بناسپتی
گھی میں شامی کباب تل دیئے تھے میں نے کبابوں کی پلیٹ زمین پر دے
ماری —— انتہا یہ ہے کہ ایک شخص کے یہاں موت کا پرسا دینے
کے لئے گئے اور اپنی خوش خوراکی کا رعب جمانے کے لئے بولے: میاں! صبر
کرو، دل تھامو، مرضیِ مولا از ہمہ اولیٰ! دنیا میں جو آیا ہے اسے ایک دن
یہاں سے جانا ہے، موت سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ پیغمبر ہی جب دنیا
میں نہ رہے تو اور کون رہے گا؟ بھائی! آب وہوا خراب ہے۔ بچوں کی
حفاظت کرنا۔ کل میرے یہاں مچھلی کا پلاؤ پکا تھا۔ بچوں نے خوب پلاؤ کھایا
بدہضمی ہو گئی۔ مجھے تو ہیضہ کا شبہ ہو گیا تھا مگر شکر ہے کہ میرا خیال غلط نکلا۔
کھانے کی بے احتیاطی کے سبب بہت سی موتیں ہو رہی ہیں۔ میں تو ناشتہ میں

دو ہلکے پھلکے اور ایک نیم برشت انڈا کھاتا ہوں۔ خدا بُرے وقت سے بچائے!

شیخ جی کے یہاں کوئی پڑوسن اُن کی بیوی سے ملنے کے لیے آگئیں۔ کھانے کا وقت تھا۔ بیوی نے اصرار کیا۔ اُس نے کھانا کھالیا، شیخ جی کے یہاں مسور کی دال پکی تھی۔ بیوی نے مہمان کی خاطر قیمہ بازار سے منگواکر جلدی جلدی پکالیا۔ شیخ جی کھانا کھاکر کسی ضرورت سے باہر گئے۔ راستہ میں پڑوسن کا شوہر اتفاق سے مل گیا اور شیخ جی نے اپنی عادت کے موافق باتوں باتوں میں کہہ دیا کہ میں دہی کا قورمہ اور فیرنی کھاکر آرہا ہوں۔ پڑوسن جب اپنے گھر آئی تو اُس کے شوہر نے کہا کہ آج تو خوب زوردار دعوت اُڑائی۔ بیوی نے جواب دیا کہ شیخ جی کی بیوی بڑی ملنسار اور متواضع ہیں۔ میرے لئے بیچاری نے قیمہ کا سالن تیار کیا۔ کھانے کے وقت کسی کے یہاں جانا ہی نہیں چاہیئے۔ شوہر اچھا یہ بولا ارے وہ شیخ جی تو کہہ رہے تھے کہ ہمارے یہاں آج دہی کا قورمہ اور فیرنی تیار ہوئی ہے۔ بیوی نے کہا تم بیچارے شیخ جی کا مذاق کیوں اُڑاتے ہو۔ غریب آدمی ہیں پھر بھی وقت کے وقت اُن کی سلیقہ مند بیوی نے دو قسم کے کھانوں کا انتظام کر دیا۔

شوہر نے جواب دیا میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ شیخ جی نے مجھ سے یہی کہا تھا۔ اس بات کے چرچے کی عورتوں میں چرچے ہونے لگے۔ اور رفتہ رفتہ یہ خبر شیخ جی کی بیوی کے کان تک پہنچی۔ شیخ جی کی بیوی نے شیخ جی سے دریافت کیا کہ تم نے اُس دن پڑوسن کے شوہر سے کیا کہا تھا۔ شیخ جی اس پر جھنجھلا کر بولے۔ میرے پاس کوئی رجسٹر تو ہے نہیں کہ کسی سے کوئی بات کی اور جھٹ اُس

میں درج کرلی - اتنے دن کی بات مجھے کیا یاد کہ میں نے کیا کہا تھا - بیوی نے تمام واقعہ دُہرایا - شیخ جی اس پر بولے ہو سکتا ہے کہ ہم نے یہی کہہ دیا ہو - بیوی نے آہستگی کے ساتھ کہا تو تم نے اتنی خلافِ واقعہ بات آخر کیوں کہی - گھر میں مسور کی دال اور قیمہ پکا تھا اور تم نے کہہ دیا کہ دہی کا قورمہ اور فیرینی تیار ہوئی ہے - شیخ جی اس پر تیز ہو کر بولے - تم تو گھر میں بیٹھکر پان چبایا کرتی ہو تمہیں کیا معلوم کہ دنیا میں آدمی کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں - اور زندگی گزارنے کے لئے ہر آدمی کو کچھ نہ کچھ مبالغہ بھی کرنا پڑتا ہے -

بیوی نے جواب دیا اوّل تو اپنے یہاں کے کھانوں کا ذکر کرنا ہی معیوب بات ہے - اور فرض کیجئے آپ کو اُس دن مبالغہ کرنے کی ضرورت پیش آگئی اور اس طرح بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے میں کوئی فائدہ تھا - لیکن پڑوسن سے میرا ملنا ہوا اور اس بات کا ذکر آگیا تو میں کیا جواب دوں گی ؟

اس پر شیخ جی بولے - اُن سے کہہ دینا کہ شیخ جی پرہیزی کھانا کھاتے ہیں اُن کو حکیم جی نے دہی کا قورمہ اور فیرینی کھانے میں بتائی تھی - اور دونوں چیزیں بس اُنہی کے قابل پکی تھیں -

بیوی نے جواب دیا میں نے تو آج تک نہیں سنا کہ کسی بیماری میں قورمہ اور فیرینی بھی مریض کو بتایا جاتا ہے - شیخ جی نے اپنے گھٹے ہوئے سر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا - تم عورتوں کی جہالت سے خدا بچا کر رکھے - دُنیا کی کسی بات کی خبر نہیں مگر ہر بات میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کرتی ہو - یہ حکیم لوگ دہی کا قورمہ اور فیرینی تو کیا زہر بھی کھانے کے لئے تجویز کردیں تو مریض کو فائدہ ہو کر

رہے۔ غذا کا پرہیز تو نسخہ کی نوعیت پر منحصر ہے ——— شیخ جی کی احمقانہ دلیلیں اور بے وقوفی کی باتیں ہر محفل میں لطف پیدا کرتیں۔ یا یوں سمجھئے کہ اپنی نادانی کا رنگ جما کر رہتیں۔ شادی کی محفل میں جب کہ دولھا سہرا باندھے بیٹھا تھا آپ نے یہ شعر ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

پڑھ دیا۔ محلّہ میں موت ہو گئی تھی۔ آپ بھی از راہِ ہمدردی اور بموجب احکامِ شریعت جنازے کے ساتھ قبرستان تک گئے۔ اور قبر کے پاس بیٹھ کر اپنی ہمہ دانی کے اظہار کے لئے تقریر شروع کر دی ؎

" مُردے کے پاس قبر میں دو فرشتے، جبرئیل اور میکائیل آتے ہیں اور مُردے سے خدا اور رسول کے بارے میں سوال کرتے ہیں - یہ فرشتے ملکِ جِن کے رہنے والے ہیں۔ کوہ قاف کی چوٹیوں پر ان کے مکانات بنے ہیں۔ گو فرشتوں کے مکانات اینٹ پتھروں کے تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ شبنم کے قطروں اور پھول کی پتیوں سے بنے ہوئے مکان! سورج کی گرمی سے کھانا پکتا ہے وہاں! ایک ایک وقت میں پچاس پچاس قسم کے کھانے! شربت، فالودہ، پھل، ہمہ قسم کے حلوے اور مربّے! ——— بھائیو! اللہ اللہ کرو۔ موت کو یاد کرو۔ نہ جانے کس کا کب آخری وقت آ پہنچے! آدمی کے ساتھ دنیا کی کوئی چیز نہیں جاتی۔ بس نیک اعمال! مجھے اس وقت نہ جانے کیوں پرانے شاعر کا ایک شعر یاد آرہا ہے ؎

اِس طرح کہ گھنگرو کوئی چھاگل کا نہ بولے
وہ چھم سے یہاں آئیں تو گودی میں اُٹھا لیں

تو بھائیو! آدمی کو قبر کی گود اور آغوشِ لحد سے بہ ہر حال سابقہ پڑنا ہی۔ شیخ جی کو اُن کی حماقت ہر محفل میں لے جاتی۔ اور اس طرح افسروں سے بھی جان پہچان ہو گئی۔ تفریح کے لئے بادشاہ بھی اپنے درباروں میں مسخرے رکھتے ہیں اور اُس کے تمسخر سے لطف اُٹھاتے ہیں۔ سرکاری عہدہ داروں کو بیہ کوڑی خرچ کئے بغیر ایک مسخرہ مل گیا تھا۔ شیخ جی کا خیال نہیں یقین تھا کہ تمام افسر سچ مچ اُن کی قدر کرتے ہیں اور برابر والوں کی طرح ملتے ہیں۔ اس غلط رنگ نے شیخ جی کی رگِ حماقت میں اور تناؤ پیدا کر دیا۔ اب وہ لوگوں سے بات چیت کرتے تو عہدہ داروں سے اپنی ملاقات کا ذکر ضرور نکالتے، رُعب جماتے بلکہ دھمکاتے —— مختلف لوگوں سے شیخ جی کی بات چیت کو نہ دُہرایا گیا تو یہ افسانہ ناتمام اور شاید پھیکا رہ جائے گا ——

قصائی سے :۔ ذرا سوچ سمجھ کر گوشت دیا کرو! پولیس کپتان سے یارانہ ہے ہمارا!

تانگے والے سے :۔ ابھی ابھی کوتوالی سے آ رہا ہوں۔ کوتوال صاحب نے اپنے ایک کام سے بُلایا تھا۔ ہم یہاں سے کچہری تک ایک آنہ سے زیادہ کرایہ نہیں دیں گے۔ قیامت تک نہیں دیں گے۔

درزی سے :۔ ڈپٹی شرما جی کو جانتے ہو، جلاد ہیں جلاد! کسی ملزم کو سزا کئے بغیر نہیں چھوڑتے۔ اُن سے دوستی ہے میری! رات دن کا

بیٹھنا اُٹھنا ہے : کل شام تک اچکن تیار ہو جانی چاہیئے !

دوستوں اور شناساؤں سے :- ارے بھئی ! ان عہدہ داروں سے تو میرا ناک میں دم ہے ۔ ان سے دوستی کیا ہوئی اپنا کاروبار چوپٹ ہو گیا ۔ آج ڈپٹی صاحب کے یہاں چائے کی دعوت ہے ۔ کل سکتر صاحب نے کھانے پہ بلا لیا ۔ صبح تحصیلدار صاحب کے گھر ناشتہ کیا اور دوپہر کا کھانا نہر کے انجنیئر صاحب کے یہاں کھانا پڑا ۔ دن رات میں آٹھ دس گھنٹے حاکموں کے ساتھ بسر ہوتے ہیں ۔ مگر حق بات کہوں گا ۔ بیچارے سب لوگ مجھ سے بڑی محبت کے ساتھ ملتے ہیں اور میرے ہر کام کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں ۔ پرسوں کو توال صاحب فرما رہے تھے ۔ شیخ جی ! کسی سے تمہاری لاگ ڈانٹ ہو تو بتاؤ ۔ اس مردود کی گوشمالی کرا دوں گا ۔ لیکن میں اتنا کم ظرف نہیں ہوں ہنس کر کہنے لگا ۔ آپ کی مہربانی سے سب لوگ میرے دوست اور ہمدرد ہیں ۔ آپ کو گوشمالی اور تنبیہہ کی زحمت گوارا کرنی نہیں پڑے گی ۔۔۔۔!

کلکٹری میں اہلکاری (کلرکی) کی چند جگہیں خالی ہوئیں ۔ یار لوگوں نے شیخ جی کی حماقت سے فائدہ اُٹھانے اور لطف لینے کے لئے اُنہیں آمادہ کیا کہ اپنے اور عہدہ داروں کے تعلقات کو اس وقت کام میں لاؤ ۔ موقع غنیمت ہے ۔ شہر کے شہر میں چالیس روپے ماہوار کی نوکری مل جائے گی ۔ اوپر سے بھی دو تین روپے روز کی آمدنی ہو جایا کرے گی ۔ افسروں سے مل کر ملازمت کے لئے کوشش کرو ۔ یہ عہدہ دار تمہاری عاقبت تو بخشوائیں گے نہیں اپنے اختیارات سے اسی دُنیا میں فائدہ پہنچا سکتے ہیں ۔ چالیس روپے ماہوار کی ملازمت اور ساتھ

ستر کا اوپر سے دستِ غیب کا نام سُنکر شیخ جی کے منھ میں پانی بھر آیا۔ گھر آئے۔ نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ آنکھوں میں سُرمہ لگایا۔ ڈاڑھی میں کنگھی کی پان کھایا اور گھر سے ایک خاص فاتحانہ انداز میں روانہ ہوئے۔ بیوی نے پوچھا کہ آج کہاں کے لئے تیاریاں ہو رہی ہیں؟ کیا کہیں دعوت ہے؟ شیخ جی مسکرا کر بولے۔ مٹھائی کھلاؤ تو ایک خوش خبری سناؤں۔ بیوی بولی۔ مٹھائی آپ کی لگی رہی مگر بات تو کہیے! شیخ جی نے فرمایا۔ ڈپٹی صاحب سے ملنے کے جا رہا ہوں۔ کلکٹری کچہری میں چالیس روپیہ ماہوار کی جگہ نکلی ہے۔ بس بیوی! تم مجھے نوکر ہوا سمجھو! اور ہاں! چالیس روپیہ تو کہنے کو ہیں۔ حق حقوق کی آمدنی بھی ہوا کرے گی۔ بھئی! میں تو کل سے سودا سلف لینے کے لئے بازار جاؤں گا نہیں! تم کسی نوکر کا انتظام کر لو اور ہاں بیگم! کچہری جانے سے پہلے کھانا تیار رہا کرے گا۔ اور ہم گوشت کے بغیر لقمہ بھی نہ توڑیں گے۔ اور سوتے وقت آدھ سیر دودھ بھی! اور یہ جو تم ایک پان میں چھ بیڑے بنا کر کفایت کرتی ہو اب کل سے ایک پان کے زیادہ سے زیادہ دو بیڑے بنا کریں گے۔ پان سادہ نہ ہوگا، الائچی اور برقی قوام بھی ہونا چاہیے۔ تم بھی کام کرتے کرتے اور چولھا جھونکتے جھونکتے تھک گئی ہو۔ تم اپنے آرام کے لئے ماما رکھ لینا۔ مگر اتنا خیال رہے آجکل کی مامائیں بڑی چالاک اور چور ہوتی ہیں۔ گھر کی چیزوں پر تمہیں نگرانی رکھنی ہوگی ——!

شیخ جی ڈپٹی صاحب کے یہاں پہنچے۔ ڈپٹی صاحب بہت ضروری کام میں مشغول تھے۔ چپراسی نے شیخ جی سے کہا کہ صاحب! ضروری کام کر رہے ہیں آپ کو تھوڑی دیر انتظار کرنا ہوگا۔ شیخ جی برآمدے میں کرسی پر اس انداز سے

ڈٹ کر بیٹھ گئے کہ آج ملازمت کا پروانہ لے کر ہی گھر واپس ہوں گے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد ڈپٹی صاحب نے شیخ جی کو اندر بلا لیا۔ اور علیک سلیک کے بعد دونوں بات چیت کرنے لگے ـــــ اُن کی گفتگو۔

ـــ شیخ جی! آج ناوقت کیسے آنا ہوا؟

ـــ ایک خاص ضرورت سے آیا ہوں۔

ـــ کہیے! کیا کام ہے آپ کا؟!

ـــ سُنا ہے کہ آپ کے دفتر میں کچھ جگہیں خالی ہوئی ہیں۔

ـــ جی ہاں!

ـــ میں اُسی کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

ـــ تو آپ اپنے کسی عزیز رشتہ دار کی سفارش چاہتے ہیں؟

ـــ جی نہیں!

ـــ تو پھر؟

ـــ میں خود ہی نوکری چاہتا ہوں۔

ـــ آپ؟ (پُرزور قہقہہ کے ساتھ)

ـــ جی! میں۔ شریف الدّین ولد کریم الدّین قوم شیخ۔

ـــ ارے صاحب! وہ ملازمتیں تو نوجوانوں کو دی جائیں گی۔

ـــ مگر ہمارا دل نوجوانوں کے دلوں سے زیادہ جوان اور شوخ ہے۔

ـــ لیکن وہاں دل نہیں چہرے دیکھے جاتے ہیں۔

ـــ ڈاڑھی پر خضاب کیا جا سکتا ہے۔

— اور یہ پچکے ہوئے گالوں کی جھریاں؟

— یہ تو غموں کے مارے میرا یہ حال ہوگیا ہے۔ والد صاحب قبلہ کی وفات کے دن سے آج تک چین نصیب نہیں ہوا۔

— سامنے کے دانت بھی تو آپ کے ٹوٹے ہوئے ہیں؟

— یکّہ سے گر پڑا تھا۔ گرنے میں دانت ٹوٹ گئے۔

— مگر میں آپ کی کس کس کوتاہی اور کمی کی تاویل کروں گا۔

— حضور چاہیں تو مُردے کو کُرسی پر بٹھا سکتے ہیں۔

— اچھا! فرض کر لیجئے کہ آپ جیسے بوڑھے کو ملازم رکھا جا سکتا ہے۔ مگر اُن ملازمتوں کے لئے تو انگریزی امتحانات میں کامیابی کی قید رکھی گئی ہے۔ اُس کا کیا ہوگا؟

— (ہنس کر) یہ آج کل کے انگریزی پڑھے لونڈے کیا ہماری برابری کر سکتے ہیں؟ ہم پُرانے زمانے کے مکتبوں کے پڑھے ہوئے ہیں جناب!

— لیکن وہاں تو سند دیکھی جاتی ہے۔ مکتبوں اور نجی اسکولوں کے تعلیم یافتوں کو کون پوچھیگا؟

— آپ پوچھیں گے اور کون پوچھے گا؟ اور اگر سند ہی درکار ہے تو اپنے محلّہ کی مسجد کے مُلّا جی سے علمی قابلیت کی تصدیق لکھا کر پیش کر سکتا ہوں۔ کریا اور ما متحان مجھے منھ زبانی یاد ہے ڈپٹی صاحب!

— (طویل مسکراہٹ) اُن نوکریوں کے لئے ایک اور قید بھی ہے۔

— وہ بھی فرما دیجئے۔ اُس کا بھی اسی وقت فیصلہ ہو جائیگا۔

—— خاندانی اعزاز —— اُمیدوار کے اسلاف واجداد کی سرکاری خدمات! اور۔۔۔۔۔۔۔

—— (بات کاٹ کر) تو سُنئے! میرے نانا صاحب قبلہ جب دہلی میں کمپنی کے نوکر تھے تو ملکہ وکٹوریہ نے اُن کو باریابی کا شرف بخشا تھا۔

—— ملکہ وکٹوریہ کبھی دہلی بھی تشریف لائی تھیں؟

—— معاف فرمائیے! ڈپٹی صاحب بہادر! آپ پڑھے ہیں مگر گنے نہیں ہیں! اتنی سی بات آپ کو نہیں معلوم کہ ملکہ وکٹوریہ کا دہلی میں بہت شاندار دربار ہوا تھا۔ بڑے بڑے راجے مہاراجے اُس میں شریک ہوئے تھے۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔۔

شیخ جی ابھی تاریخی انکشافات فرما ہی رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی، ڈپٹی صاحب ٹیلی فون پر بات چیت کرنے لگے۔ کلکٹر صاحب نے فرمایا کہ ایک ضروری کام ہے فوراً آؤ۔ ڈپٹی صاحب اگر شیخ جی سے صاف طور پر کہہ دیتے کہ تمہیں نوکری نہیں مل سکتی تو شیخ جی اُن کے پیچھے پڑ جاتے۔ اور دلیلیں دیتے اور سمجھاتے سمجھاتے ڈپٹی صاحب کا ناطقہ بند ہو جاتا۔ ڈپٹی صاحب نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا کہ تم کل ایک درخواست لے کر آؤ۔ اُس میں ملکہ وکٹوریہ اور اپنے نانا کی ملاقات کا حال ضرور درج کر دینا۔ میں تمہاری عرضی کلکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ کامیابی اور ناکامیابی خدا کے اختیار میں ہے۔ مگر میں اپنی طرف کوتاہی نہ کروں گا——

—— شیخ جی خوش خوش گھر چلے آئے۔

نوکری تو جبر اُن کو کیا ملتی، یار لوگوں کو تفریح کا ایک نیا موضوع ہاتھ آگیا۔ اس قسم کے بہت سے ٹکڑے شیخ جی کے افسانہ حیات میں موجود تھے۔ اُن کی حماقت بھیس بدل بدل کر اور نئے نئے روپ اختیار کر کے منظرِ عام پر آتی ——— شہر میں ایک طوائف کے یہاں لڑکی کی پیدائش پر بہت بڑا جشن تھا۔ ایک محلہ والے نے شیخ جی سے دریافت کیا کہ شہر کے بڑے بڑے تمام لوگوں کو طوائف نے اپنے یہاں بلایا ہے۔ کیا تمہارے پاس بھی دعوت نامہ آیا ہے؟ شیخ جی چونک کر بولے دعوت نامہ آئے گا اور ضرور آئے گا۔ طوائف ہمیں نہ بلائے گی تو شہر میں رہ بھی سکے گی۔ !

شیخ جی کو دعوت میں جانے کی فکر ہوگئی اور یہ سُن سُن کر کہ دعوت میں دس بارہ قسم کے کھانے ہوں گے۔ دہلی اور لکھنؤ سے تو باورچی بلوائے گئے ہیں۔ شیخ جی کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ طوائف سے یا اُس کے یہاں کے آنے جانے والوں سے شیخ جی کی جان پہچان نہ تھی۔ اس پر بھی شیخ جی نے اپنے جاننے والوں سے باتوں باتوں میں پوچھا کہ فلاں طوائف کے یہاں کون آنا جانا ہے۔ یار لوگ تو ایسے تفریحی موقعوں کے منتظر رہتے تھے۔ ایک شخص نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا کہ بڑی مفتی صاحب وہاں آتے جاتے ہیں۔ شیخ جی نے اس پر افسوس اور حیرت کا اظہار کیا۔ کہ مفتی صاحب کو ایسا نہ کرنا چاہیے اور مجھے تو اُن کے وہاں جانے پر شدید حیرت ہے۔ لوگوں نے کہا۔ اجی حضرت! آپ مفتی صاحب قبلہ کے

تقدس اور بزرگی کو شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں؟ مفتی صاحب وہاں گانا سننے اور مزے لینے کے لئے نہیں، نماز روزے کی تبلیغ کرنے کے لئے تشریف لے جاتے ہیں۔ اعتراض جڑنے سے پہلے معاملہ کی تحقیق تو فرما لیا کیجئے! اس پر شیخ جی نے فرمایا۔ بھائی! توبہ کرتا ہوں۔ مجھے اپنی بدگمانی پر ندامت ہے۔

شیخ جی دوسرے دن مفتی صاحب کے یہاں پہنچے۔

—— آیئے! شیخ جی، آیئے!! مزاج تو اچھا ہے؟

—— جی ہاں خدا کا فضل اور آپ بزرگوں کی دعا ہے۔

—— بہت دنوں میں ادھر پھیرا ہوا آپ کا؟

—— قبلہ! دعوتیں اور جلسے میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ہفتہ میں کئی کئی دن دعوتوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔

—— بڑے خوش قسمت ہیں آپ۔

—— مگر آپ کی دعوتوں کا نمبر بھی مجھ سے کم نہیں رہتا۔

—— نہیں بھئی! آپ کی اور بات ہے! ہمارا کیا ہے۔ مہینہ میں ایک دو بار کہیں سے دعوت آ گئی تو چلے گئے۔ ورنہ گھر کی دال روٹی پر گزر ہوتی ہے۔ پلاؤ زردہ تو آپ کی قسمت میں ہے۔

—— لیکن پرسوں جس دعوت میں آپ تشریف لئے جا رہے ہیں وہ ایک دعوت سو دعوتوں کی برابر ہے۔

—— دعوت —؟ (حیرت کے ساتھ)

—— جی ہاں! انجمن آرا کے یہاں!

—— کون انجمن آرا؟ (حیرت میں اور اضافہ ہوگیا)

—— جہاں آپ نماز روزے کی تبلیغ کرنے کے لئے جایا کرتے ہیں۔

—— انجمن آرا کسی گاؤں کا نام ہے؟ آپ یہ کیا معموں میں گفتگو فرما رہے ہیں؟

—— (مسکرا کر) آپ مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں قبلہ!

—— ارے صاحب! آپ جیسے ہوشمند اور عقلمند کو تو افلاطون بھی بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ آپ تو سر سے پیر تک عقل ہی عقل اور فراست ہی فراست ہیں۔

—— شکریہ! انجمن آرا ہمارے شہر کی بہت مشہور طوائف ہے۔

—— طوائف ہے وہ؟ میں اُس کے یہاں جایا کرتا ہوں، اور اُس نے مجھے دعوت میں بُلایا ہے؟ خوب! یہ کس نے بہکا دیا ہے آپ کو؟

تھوڑی دیر بات چیت کرکے شیخ جی گھر چلے آئے اور آخر انتظار کرتے کرتے دعوت کا دن بھی آگیا۔ لیکن نہ تو وہاں سے بُلاوا آیا اور نہ کوئی جان پہچان کا آدمی ملا جو دعوت گاہ تک پہنچا دیتا۔ اب یہ معرکہ اُن کو خود ہی سر کرنا تھا۔ طبیعت اُکساتی اور اُبھارتی کہ اتنی شاندار دعوت روز روز نہیں ملتی۔ وہاں کسی نہ کسی طرح پہنچنا ضروری ہے۔ عقل اور غیرت (جو برائے نام باقی رہ گئی تھی) روکتی کہ اب تک جو بے بُلائے دعوتوں میں جاتے رہے وہ اور بات تھی۔ مگر طوائف کے یہاں اس طرح دعوت میں پہنچ جانا کسی طرح

مناسب نہیں۔ دل اور دماغ میں جنگ ہوتی رہی۔ آخر کار شیخ جی کی چھوری طبیعت نے عقل کے فیصلوں کو یک قلم منسوخ کر دیا۔

طوائفوں کا محلہ شہر کے بالکل کنارے پر تھا۔ شیخ جی بول کسی ضرورت سے کبھی کبھار اُدھر سے ضرور گزر جاتے مگر وہ کسی طوائف کے یہاں آج تک نہیں گئے اور نہ اُن کے جاننے والوں میں سے کوئی حسن کے بازار کا تماش بین تھا۔ اس محلّے کے لوگوں سے شیخ جی کی صاحب سلامت اور جان پہچان نہ تھی۔ شیخ صاحب مغرب کے بعد گھر سے روانہ ہوئے۔ بیوی نے پوچھا تو کہہ دیا کہ ایک دوست کے یہاں میری دعوت ہے۔ رات کا کھانا نہیں کھاؤں گا۔ بیوی بولی۔ کب تک واپس آؤ گے؟ شیخ جی تُرش رُو ہو کر بولے۔ دعوت کا معاملہ ہے، پرایا گھر ہے۔ نہ جانے کب تک فرصت ہو۔ کھانا کھا کر ایکا ایکی تو دعوت کے گھر سے نہیں چل پڑتے ہیں۔ تھوڑی دیر بات چیت بھی ہوتی ہے۔ اور دعوتیں عام طور پر اسی لئے کی جاتی ہیں کہ دوست احباب کھانا کھائیں، ساتھ اُٹھیں بیٹھیں، ہنسی مذاق رہے، بات چیت کی جائے۔ اس طرح تعلقات میں استواری اور خوش گواری پیدا ہوتی ہے۔

بیوی نے اس پر کہا کہ میری ایک ملنے والی رات کو آئیں گی کھانا کھا کر، عشا کی نماز کے بعد، بہت ممکن ہے کہ اُن کے ساتھ کوئی مرد بھی آئے۔ اگر ایسا ہوا تو آپ دعوت میں کس کے یہاں جا رہے ہیں۔ پتہ دے جائیے، میں محلّے کے کسی لڑکے کو آپ کے پاس بھیجدوں۔ اس طرح دعوت سے آپ کو جلد چھٹکارا مل جائے گا اور آپ اپنی ضرورت کا اظہار کر کے وہاں سے جلد آسکیں گے۔

شیخ جی ازار بند اُڑستے ہوئے بولے (قدرے توقف کے ساتھ) جن کے یہاں میری دعوت ہے۔ وہ کوئی مشہور آدمی نہیں ہیں۔ گلی در گلی ہے مکان اُن کا۔ نئے آدمی کو مِل ہی نہیں سکتا۔ میں خود وہاں سے جلد آنے کی کوشش کروں گا۔

شیخ جی طوائفوں کے محلّے میں پہنچے۔ ایک مکان پر خوب روشنی ہو رہی تھی اور لوگ جا آ رہے تھے۔ نوبت نقارہ بج رہا تھا، اب کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ انجمن آرا کا مکان کس طرف واقع ہے؟ اور دعوت کا انتظام کدھر ہے؟ اور اگر یہ کسی اور طوائف کا مکان بھی ہوتا تو بھی شیخ جی کی مُراد پوری ہو جاتی۔ اُن کو تو دعوت کھانے سے سروکار تھا۔ اب وہ دعوت چاہے انجمن آرا کی ہو یا سرسوتی بائی کی! دروازے پر پہنچ کر شیخ جی ذرا گھبرائے کہ مبادا کوئی روک دے! اُسی وقت آٹھ دس آدمی دروازے میں داخل ہوئے اور اُن کے ساتھ ہمارے شیخ جی بھی اندر پہنچ ہی تو گئے۔ اندر پہنچ کر شیخ جی نے دیکھا کہ مکان شیش محل بلکہ پری خانہ بنا ہوا ہے، جھاڑ، فانوس، جھنڈیاں، خوش نما بیلیں، قیمتی پردے، قالین، گاؤ تکیے۔ اور سب سے بڑھ کر شہر کی تمام طوائفیں پورے بناؤ سنگھار کے ساتھ موجود تھیں۔ شامیانہ کے نیچے بڑے سلیقہ کے ساتھ کھانے چُنے تھے، شیخ جی ہاتھ دھو کر بیٹھ ہی تو گئے کھانا کھاتے ہیں وہ کنکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے جاتے تھے کہ کوئی اُن کی طرف شبہ کی نگاہ سے تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ جی یہاں کے تمام لوگوں کے لئے اجنبی تھے۔ لیکن عام طور پر لوگوں نے یہ سمجھا کہ کسی طوائف کے یہاں کوئی باہر کا سازندہ آگیا ہے۔ اور طوائفوں کے یہاں ایسا ہوتا رہتا ہی

شیخ جی نے سازندوں کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ طوائفیں شیخ جی کو دیکھ کر سمجھ رہی تھیں کہ کوئی بہت بڑے تجربہ کار "استاد جی" کسی گانے والی کے یہاں نئے نئے آئے ہیں۔ کئی طوائفوں نے انہیں "استاد جی" کہہ کر سلام کیا۔ "استاد جی" کے خطاب پر شیخ جی نے چونک کر اور جھینپ کر گردن جھکالی کھانے متعدد اور لذیذ تھے، مگر طبیعت میں تذبذب، دل میں دھکڑ پکڑ، اور خیالات میں الجھاؤ ہو تو من و سلویٰ میں بھی مزہ نہیں آسکتا۔ شیخ جی نے کھانا کھایا مگر زہر مار کر کے! ہاتھ دھونے کے بعد وہ چپکے سے گھر چلے آئے۔ بات آئی گئی ہو گئی —

اُسی محفل میں ایک طوائف کا قیمتی زیور کھو گیا۔ جستجو ہوئی، جن لوگوں پر شبہ تھا اُن کی جامہ تلاشی لی گئی۔ مگر چیز نہ ملنی تھی نہ ملی۔ آپس میں مشورہ ہونے لگا کہ آخر زیور کہاں گیا؟ ایک بوڑھی نائکہ نے کہا کہ میں نے دسترخوان پر ایک اجنبی سازندے کو دیکھا تھا وہ کہاں ہے؟ لوگوں نے کہا بے شک ایک نیا آدمی پہلے دسترخوان پر بیٹھا تو تھا۔ مگر وہ کھا کر چلا گیا۔ سب نے بالاتفاق کہا کہ وہی شخص زیور چرا کر لے گیا اور وہ شہر کا اُٹھائی گیرہ تھا جو چوری کے خیال سے یہاں آیا تھا۔ پولیس میں اس واقعہ کی رپورٹ کی گئی اور جن سازندوں کے قریب بیٹھ کر شیخ جی نے کھانا کھایا تھا وہ شہر میں آتے جاتے لوگوں کو نگاہِ جستجو سے دیکھنے لگے!

اِس واقعہ کے چند دن بعد ایک سازندہ بازار سے گزر رہا تھا۔ شیخ جی ایک دوکان سے سودا سلف لے رہے تھے۔ شیخ جی کا حلیہ اور لباس اس وضع

قطع کا تھا کہ آدمی ایک بار اُنھیں دیکھ کر بھول ہی نہیں سکتا تھا، سازندے نے شیخ جی کو پہچان کر سلام کیا۔ شیخ جی نے بے نیازی کے ساتھ جواب دیا۔

—— آج ہاتھ آئے ہیں آپ!

—— کیا کہہ رہے ہو تم؟

—— میں یہ کہہ رہا ہوں کہ سیدھی طرح تھانے چلئے!

—— تھانے! دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے تمہارا؟

—— یہ کوتوالی میں جا کر معلوم ہو جائے گا کہ کس کا دماغ خراب ہے!

شیخ جی اور سازندے میں تیز گفتگو ہونے لگی اور بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ سازندے نے شیخ جی کی اچکن کا دامن تھام لیا کہ میں تم کو کوتوالی لے کر چلوں گا۔ بہت تلاش کے بعد تم ہاتھ آئے ہو۔ سازندہ اُن کو کشاں کشاں کوتوالی لے گیا۔ کوتوال شیخ جی کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔ سازندے نے تمام واقعہ بیان کیا۔

کوتوال نے شیخ جی سے تنہائی میں گفتگو کی۔ شیخ جی نے کہا کہ بھئی! اتنا قصور تو میرا ضرور ہے کہ میں دعوت میں بن بُلائے چلا گیا۔ ہوا یہ کہ میں اُدھر سے گزر رہا تھا۔ میں نے ایک دروازے پر روشنی دیکھی۔ باجے بج رہے تھے۔ میں سمجھا کہ کوئی تماشا ہو رہا ہے یا کوئی قومی جلسہ ہے! میں اندر چلا گیا۔ وہاں جا کر دیکھا تو دسترخوان بچھا ہے۔ لوگ کھانا کھا رہے ہیں۔ میں بھی کھانا کھانے کے لئے بیٹھ گیا۔ میں تو وہاں مشکل سے بیس پچیس منٹ رہا۔ کھانا کھا کر سیدھا گھر چلا آیا۔ کوتوال شیخ جی سے اچھی طرح واقف تھے کہ یہ حضرت احمق اور بے غیرت تو ہیں۔ مگر چور نہیں ہیں۔ وہ شیخ جی کو ساتھ لے کر باہر آئے۔

—— یہ ہمارے دوست شیخ جی ہیں، شیخ جی! —— کوتوال نے سازندے سے کہا۔

—— ہمارے یہاں تو بہت سے سازندے شیخ جی کہا مت برصاحب ہوا کرتے ہیں —— سازندے نے جواب دیا۔

—— یہ میری توہین ہو رہی ہے، کوتوال صاحب! —— شیخ جی تیز لہجے میں بولے۔

—— آپ اپنی جگہ مطمئن رہیے دُنیا میں کوئی شخص آپ کی توہین نہیں کر سکتا۔ آپ کی توہین ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ کی عزت کی سطح بہت بلند ہے۔ اِن توہین کرنے والوں کا ہاتھ وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتا —— کوتوال نے جواب دیا۔

—— تو صاحب! اِن سے یہ پوچھیے کہ اِن کو دعوت میں کسی نے بُلایا تھا —— سازندے نے دریافت کیا۔

—— اِن سے پُوچھنے کی کیا ضرورت ہے! ہمارے شیخ جی کو شہر کی ہر دعوت میں شرکت کرنے کا پیدائشی حق حاصل ہے۔ اور دُنیا کا کوئی قانون کسی انسان سے اُس کے پیدائشی حق کو چھین نہیں سکتا۔ جاؤ اُٹھو فوراً چلے جاؤ۔ شیخ جی کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو سر نگاہ پر شیخ جی کو ایک دعوت کھلانی پڑے گی —— کوتوال نے مُسکرا کر جواب دیا۔ اور سب لوگ ہنسنے لگے۔

شیخ جی کوتوالی سے روانہ ہوئے۔ تماشائیوں کا ہجوم اُن کے ساتھ

تھا۔ ایک من چلے لڑکے نے کہا۔

"دوستو! شیخ جی غیرت اور حمیت کے پتلے ہیں۔ وہ کسی کے یہاں بھلا بے بلائے جا سکتے ہیں! میں تو سمجھتا ہوں کہ حسن کے بازار میں شیخ جی کا کسی پر دل آگیا ہے۔ اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر شیخ جی نے اپنی عزت کی قربانی گوارا کی۔ محبت میں آدمی کو سب کچھ کرنا پڑتا ہے"!

شیخ جی نے اس پر گردن نیچی کر لی۔ اور لڑکوں نے پر قینچ عاشق کہہ کر تالیاں پیٹ دیں۔

کانفرنس

جذبۂ آزادی کی یہ خاصیت ہے کہ وہ دبانے سے اور ابھرتا ہے۔ سختیوں اور جبر کوشیوں سے قومی تحریکوں میں جان پڑتی ہے۔ انقلاب کا طوفان چٹانوں سے ٹکرا کر اور تیز رفتار ہو جاتا ہے۔ جور و ظلم سے آزاد پسندوں کے حوصلے بڑھتے ہیں اور قید خانوں میں حریت پسند زندگی اور بے باک ہو جاتی ہے۔ آزادی کا آفتاب اس وقت تک طلوع نہیں ہوتا جب تک افق قربانیوں سے لالہ گوں نہ ہو جائے۔

قربانی، ایثار، خلوص اور جہدِ مسلسل ـــــــ یہ کائناتِ آزادی کے اربعہ عناصر ہیں۔ قربانی میں خلوص نہ ہو تو طوفانی آغاز، سکون پذیر انجام سے بدل جاتا ہے۔ اور سکون اس عالمِ حادثات اور جہانِ تغیرات میں "موت" کا دوسرا نام ہے۔ عمل چاہے کم سے کم کیوں نہ ہو اُس میں تسلسل اور مداومت ہونی چاہیے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے سے بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ قطروں سے دریا، اور ذرّوں سے صحرا بنتے ہیں! کوشش پیہم کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ تاریخ کے صفحات پکار پکار کر شہادت دے رہے ہیں بلکہ اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ جن لوگوں نے قوموں میں انقلاب پیدا کیا ہے اُن کی زندگی کی ایک سانس بھی ٹھنڈی چھاؤں میں بسر نہیں ہوئی۔ ـــــــ تو اسی جذبہ نے ہندوستان کے طول و عرض میں بھی ایک شور برپا کر دیا کہ "آزادی ہندوستانیوں کا پیدائشی حق ہے" جو لوگ حکومت کے آگے زبان کھولتے ڈرتے تھے اب وہ ڈنکے کی چوٹ حکومت کے خلاف شعلہ بار تقریریں کرنے لگے۔ شبستانوں میں رہنے والوں نے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں جانا قبول کر لیا۔ جن کے پاؤں سیج صبح "فرشِ مخمل" کی سلوٹ سے چھبن محسوس کرتے تھے اب وہ آزادی کا غلغلہ بلند کرنے کے لئے دیہاتوں کا پیدل سفر کرتے اور جن کے سر میں غنچہ کی چٹک سے دھمک محسوس ہوتی تھی وہ بندوقوں کی آوازوں اور گولیوں کی بوچھاروں میں سینے تان کر کھڑے ہو جاتے۔

نیاز مندوں اور غلاموں کے بگڑتے تیوروں کو دیکھ کر حکومت پریشان تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ آستانے پر جھکے ہوئے سر، آقائیت اور کج کلاہی

سے ٹکرا رہے ہیں۔ مُردوں میں یکایک زندگی کہاں سے آ گئی؟ بے جان پتھر کس طرح حرکت کرنے لگے؟ سوتوں کو یہ کس نے جھنجوڑ کر جگا دیا؟ قفس نصیب پرندوں کو احتجاج کے ڈھنگ کس نے سکھا دیئے؟ جو کل تک پراگندہ اور منتشر تھے وہ آج منظم کس طرح ہو گئے؟ غلامی آزادی کے خواب دیکھنے لگی! تنکے طوفان کے مقابل کھڑے ہو گئے! شبنم کے قطرے سورج سے اُلجھ رہے ہیں! شیشے پہاڑوں سے ٹکرا رہے ہیں! ——— یہ نہیں ہو سکتا، قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ شہنشاہی اس ہنگامہ بغاوت اور شورِ احتجاج کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ شورش پسندوں کو کچل دیا جائے گا۔ مفسدوں کی سرکوبی کی جائیگی۔ ہنگامہ بپا کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جائیں گی۔ فتنے طاقت کے زور سے دبا دیئے جائیں گے۔ دُنیا کی کوئی حکومت بھی اپنی مخالفت گوارا نہیں کر سکتی۔ تھوڑے بہت حقوق دینے کا مطالبہ ہوتا تو ایک بات تھی یہاں تو "آزادیٔ کامل" کی اسکیمیں تیار ہو رہی ہیں۔ حکومت کا تختہ اُلٹنے کے خواب دیکھے جا رہے ہیں۔ اور پھر غلامی میں آزادی کا سودا سما گیا ہے ——— حکومت کے اربابِ حل و عقد ان ہی مسائل پر غور کر رہے تھے اور تحریکِ آزادی کو دبانے کے لئے حکومت کی مشینری حرکت میں آ گئی تھی۔

جلسے، تقریریں، جلوس، ہڑتال ——— اور ان کے جواب میں پولیس کے ڈنڈے، گولیاں، جیل خانے اور تشدد ——— تمام مُلک میں ایک آگ سی لگی تھی۔ جہاں کوئی لیڈر گرفتار ہوا اور بازار بند ہو گئے۔ یہاں تک کہ قلیوں اور تانگہ والوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ طالب علموں نے اس سلسلہ میں

سب سے زیادہ سرگرمی دکھائی۔ جلسوں، ہڑتالوں، جلوسوں اور ہنگاموں کی کمان اُنہی جوانانِ نوخیز کے ہاتھوں میں تھی۔ والدین اور سرپرستوں نے روک ٹوک کی تو لڑکے کہنے لگے کہ آپ کے ہر حکم کی تعمیل ہمارا اخلاقی فرض ہے مگر خدا کے لئے اس معاملہ میں ہم سے کچھ نہ کہئے۔ اگر آپ ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے تو کم سے کم ہماری راہ میں رُکاوٹیں تو پیدا نہ کیجئے! آزادی کے لئے جدوجہد کرنا کوئی گناہ نہیں ہے، پنجرے میں مقید چڑیا بھی اُڑ جانا چاہتی ہے، ذلیل کُتّے بھی گلے میں زنجیر دیکھ کر بے آرامی محسوس کرتے ہیں۔ اب رہی تعلیم تو غلامی کے سایہ میں علم بھی فکر و نظر کی تربیت نہیں کر سکتا۔ علم کا سب سے بڑا مقصد فکر و خیال کی آزادی، فراست کی نقابیں اور شعور کی تربیت ہے اور غلامی میں یہ باتیں حاصل نہیں ہو سکتیں ——— یہ نوجوانوں کے خیالات، عزائم اور حوصلے تھے، آزادی کا فرشتہ غلام قوموں میں سب سے پہلے جوانوں کو آواز دیتا ہے کہ

تمہارے گرم خون کو شعلۂ جوالہ بننا ہے
شبستانوں میں آخر انجمن آرائیاں کب تک؟

جوان بیدار ہوتے ہیں اور سرگرم سفر ہو جاتے ہیں۔ انقلاب تجربہ کار بوڑھوں کی فکر اور جوانوں کے خونِ گرم کے سہارے نشو و نما پاتا ہے۔ جذبِ بے دانش اور جوشِ بے عقل سے تخریب تو ہو سکتی ہے مگر تعمیر نہیں ہو سکتی۔ اور قوموں کی زندگی تعمیر سے بنتی ہے۔ اندھا دُھند جوش جو فکر و بصیرت سے عاری ہو مضرت رساں ثابت ہوتا ہے۔ جذبات کے انتہائی شباب میں بھی فکر کو آوارہ اور خرد کو بے راہ رَو نہ ہونا چاہئے ——— جوان اور بوڑھے سبھی اس تحریک کی

ساتھ دے رہے تھے۔

کشن پور میں بھی دوسرے شہروں کی طرح تحریک آزادی پورے جوش بلکہ شباب پر تھی۔ وہاں کے درودیوار سے "انقلاب زندہ باد" کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ہر طرف زندگی، حرکت اور بیداری کے آثار نظر آتے تھے۔ ضلع کی سیاسی کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دریا کے کنارے لمبا چوڑا پنڈال بن رہا تھا۔ دیہات کے سیکڑوں آدمی رضا کارانہ طور پر پنڈال کی تعمیر میں کام کر رہے تھے۔ آزادی کے تصوّرات نے ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔

حکومت نے عوام کے بڑھتے جوش کو دیکھ کر امتناعی حکم جاری کر دیا کہ اجلاس کے لئے نہ تو حکومت زمین دے سکتی ہے اور نہ کوئی اجتماع منعقد ہو سکتا ہے۔ شہر کی سیاسی فضا ناخوشگوار اور مکدّر ہے ہر لمحہ ٹکراؤ، تصادم اور شورش کا اندیشہ ہے اور شورش کی روک تھام حکومت کا سب سے پہلا فریضہ ہے۔ ملک میں بہت سے مقامات پر شورشوں کے ہاتھوں امنِ عامّہ خطرے میں پڑ چکا ہے۔ لیڈر تو تقریریں کر کے اور جوش دلا کر چلے جاتے ہیں مگر عوام اُس جوش کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکخانوں کے لیٹر بکس جلائے جاتے ہیں، ریل کے کھمبے اُکھاڑے جاتے ہیں۔ برقی تاروں کو کاٹ دیا جاتا ہے۔ غرض حکومت کی مخالفت کے جوش میں اس قسم کی حرکات ظہور میں آتی ہیں کہ رفاہِ عام پر اُن کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔

حکومت کے اس اعلان نے لوگوں میں اور جوش پیدا کر دیا۔ گرفتاری کیلئے

جتھے تیار ہونے لگے۔ شہر کے لوگوں نے کہا کہ حکومت کے اس حکم کی خلاف ورزی کی جائے گی، اجلاس ہوگا اور ضرور ہوگا چاہے وہ ہماری لاشوں پر ہی کیوں نہ ہو۔ یہ قوم کی عزت اور وطن کی لاج کا سوال ہے۔ ہم وطن کی عظمت کو نیچا نہ ہونے دیں گے۔ حکومت کے پاس فوج ہے، پولیس ہے، مشین گنیں ہیں اور ہمارے پاس خلوص ہے، وطن کی محبت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قوم و ملک کی خاطر مر جانے کا جذبہ ہے! ہم حکومت کی سختیوں کا جواب سختیوں سے نہیں نرم مقاومت سے دیں گے۔ ہمارا مقابلہ تشدد آمیز نہ ہوگا کیونکہ تشدد ہمارے بنیادی مسلک کے خلاف ہے۔

حکومت نے لوگوں کے جوش کا اندازہ کیا کہ سارے ضلع میں اس امتناعی حکم کے خلاف شدید ناراضی پھیل گئی ہے۔ جگہ جگہ جلسے ہو رہے ہیں جن میں حکومت کے اس طرزِ عمل کے خلاف ملامت کی تجویزیں منظور کی جا رہی ہیں۔ ستیاگرہ کے لئے جتھے بن رہے ہیں۔ یہ رنگ دیکھ کر ضلع کے ذمہ دار عہدہ دار نے جلسہ کے منتظمین سے گفت و شنید شروع کر دی۔ کئی دن تک گرما گرم بحث ہوتی رہی۔ افسر ضلع نے دھمکی دی کہ شہر کے ایک ایک چپہ پہ مسلح فوج متعین کر دی جائے گی۔ حکومت نے اب تک درگزر سے کام لیا مگر اب سختی کا برتاؤ کرنا پڑے گا۔ شورش انگیزیوں کو اب گوارا نہ کیا جائے گا۔ ہر گورنمنٹ اپنے اقتدار کے رکھ رکھاؤ اور وقار کے لئے انتہائی کوشش کرتی ہے۔ بہرحال حکومت نے اب اپنی پالیسی بدل دی ہے، صلح و آشتی، عفو و درگزر کا زمانہ گزر گیا اب ہر بے اعتدالی کا جواب

طاقت سے دیا جائے گا ۔ ان تمام باتوں کے علاوہ ضلع کے عوام آپ کے ساتھ نہیں ہیں ۔ کچھ سر پھرے لوگ مل کر ہنگامے کرتے رہتے ہیں اور بہت سی تماشائی ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں ۔ جب سے اس تحریک کا آغاز ہوا ہے ۔ پبلک کا امن خطرے میں پڑ گیا ۔ آج ہڑتال ، کل جلسہ ، پرسوں جلوس ، ان مظاہروں نے شہر کی تجارت کو بے حد متاثر کیا ہے ۔

اس کے جواب میں قومی کارکنوں نے کہا :" حکومت نے حالات کا اندازہ کرنے میں یا تو غلطی کی ہے یا وہ جان بوجھ کر غفلت برت رہی ہے ۔ ضلع کی اکثریت ہمارے ساتھ ہے ۔ عوام کی بیداری اور جوشِ عمل کے بل بوتے پر تو ہم یہ سب کچھ کر رہے ہیں ۔ بہر حال ہماری کمیٹی کا فیصلہ ناقابلِ تبدیل ہے ۔ اجلاس ہوگا اور ضرور ہوگا چاہے آپ ہندوستان بھر کے فوجی مرکز سے فوج کیوں نہ بلوا لیں ۔ جو قدم اٹھ گیا ہے وہ پیچھے نہ ہٹے گا ۔ ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ رہے ہیں ۔"

کئی دن کی گفت وشنید کے بعد یہ بات طے پائی کہ جلسہ منعقد کیا جا سکتا ہے ۔ مگر پریسیڈنٹ کا جلوس شہر میں نہ نکلیگا ۔ صدر کے استقبال کے لئے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو ریلوے اسٹیشن جانے کی اجازت دی جا سکتی ہے ۔

جلسہ کے انتظامات کے لئے لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کی بھی ایک والنٹیر کور قائم ہوئی اور بہت جوش اور ذوق وشوق کے ساتھ لڑکیاں رضاکار بننے لگیں ۔ شہر کے بعض لوگوں نے اعتراض بھی کیا کہ عورتوں کو اس ہنگامہ سے دور رکھا جائے تو بہتر ہے ۔ مردوں اور عورتوں کی یکجائی اور میل جول سے

خطرناک نتائج کے ظہور میں آنے کا اندیشہ ہے۔ اس کے جواب میں کہا گیا
کہ یہ تو کورو پانڈوں کے زمانے کے فرسودہ خیالات ہیں۔ اب حالات بدل
چکے ہیں۔ سوسائٹی کا نقشہ وہ نہیں رہا۔ جو اب سے کچھ دن پہلے تھا۔ عورتوں
کو اب مردوں کے دوش بدوش کام کرنا ہوگا۔ قومی کاموں میں عورتوں
کے شامل ہونے سے اور جان پڑ جائے گی۔ عورتوں کو پردے میں معطّل اور
بے خبر بٹھا کر رکھنا دراصل اُن کے ساتھ ناانصافی ہی نہیں بلکہ پوری صنفِ
نازک کی توہین ہے۔ انقلابِ رُوس میں عورتوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ یُورپ
کی عورتیں جدوجہد کی منزل میں مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ آزادی صرف مردوں
کی کوششوں سے نہیں مل سکتی۔ سوسائٹی کے ایک ایک فرد کو اس کش مکش میں
شریک ہونا ہوگا۔ اب رہا نقاب دبے نقابی کا مسئلہ کسی گھر میں اگر آگ لگ
جائے تو اُس وقت عورتوں کی بے حجابی کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔
یہی حال ہمارے مُلک کا ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنی قدیم
فرسودہ روایات کی بھی قربانی دینی ہوگی۔

اعتراض کرنے والے بے چارے خاموش ہو کر رہ گئے اگر وہ اور زیادہ
کچھ کہتے تو اُن کو غلام، سرکار پرست، ٹوڈی، بُزدل اور نہ جانے کیا کیا
خطابات بارگاہ حُرّیت سے عطا کئے جاتے۔

پنڈال تیار ہوا اور نہایت شاندار پنڈال تیار ہوا۔ خوبصورت دروازے
رنگین جھنڈیاں، جاذبِ نظر نقشے اور کتبے۔ لیڈروں کی قدِ آدم تصویریں۔
شاہانہ ڈائس۔ جس کا شامیانہ کاغذ کے نہایت خوشنما پھولوں اور قندیلوں

سے بنا تھا۔ تخت پر زریں قالین بچھا تھا۔ اور صدر دروازے سے لے کر ڈائس تک جو راستہ تھا اُس کے دونوں طرف رنگ برنگ کے گملے رکھے تھے۔ قومی جوش اور حُبِ وطن کی بدولت مہینوں کا کام دنوں میں ہوا۔ لوگ فریضہ بلکہ عبادت سمجھ کر مصروفِ کار تھے۔ دُور دُور شہرت ہو گئی اور دھوم مچ گئی۔ کہ اس نواح میں کیا دوسرے صوبوں کے کسی اجلاس کا بھی اتنا شاندار پنڈال نہیں بنا۔ شہر کے لوگ بہت خوش تھے کہ لیڈر اُن کی تنظیم، قومی جوش اور سیاسی انہماک کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کریں گے۔ اخباروں میں اُن کی کارگزاریوں کو سراہا جائے گا اور باہر سے آئے ہوئے تماشائی، مہمان اور ڈیلی گیٹ انتظامات دیکھ کر تعریفیں کریں گے۔

شہر کے لوگ بے تابی کے ساتھ ایک ایک دن گن رہے تھے۔ آخر کانفرنس کی تاریخ بھی آ گئی۔ پریسیڈنٹ اور دوسرے رہنما تشریف لائے۔ اور کانفرنس شروع ہو گئی۔ مجلسِ استقبالیہ کے صدر نے مختصر مگر جامع خطبہ پڑھا جسے عام طور پر پسند کیا گیا۔ کانفرنس کے صدر کا ایڈریس بہت زیادہ پُرجوش اور حوصلہ افزا تھا۔ ایک ایک جملہ پر چیرز دیئے گئے۔ "زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے۔ پریسیڈنٹ کو بعض مرتبہ تو کئی کئی منٹ رُک جانا پڑا، سامعین جوش کے مارے بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ اُس کے اس جملہ پر ا۔

"بھائیو! کیا عجب ہے کہ ہمیں اپنے خون سے ہندوستان کے مستقبل کی تاریخ لکھنی پڑے"

پنڈال ٹیجے اور "انقلاب زندہ باد" کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ حاضرین

محسوس کر رہے تھے کہ آزادی کی منزل اب قریب تر ہو گئی ہے اور اس قدر احساس و بیداری اور جوش و حرکت کے بعد کوئی قوم بھی غلام نہیں رہ سکتی۔ اب کوئی دن میں غلامی کی زنجیریں چھن سے ٹوٹنے والی ہیں اور محکومی کا تار و پود بکھرنے والا ہے۔

کانفرنس کی تاریخ آغاز سے بہت پہلے لڑکے اور لڑکیاں انتظامات میں مصروف تھیں۔ جوانی، حسن، بے حجابی، تنہائی کی فرصتیں، بات چیت اور ملنے جلنے کے مواقع، جوان اُمیدیں، گرم ولولے، نوخیز تمنائیں۔ آتشیں آرزوئیں ——— بس یوں سمجھئے کہ بہت سی قیامتیں ایک مرکز پر جمع ہو گئی تھیں، سیکڑوں فتنے ایک نقطہ پر سمٹ کر آ گئے تھے۔ آندھیاں طوفان کے مقابل تھیں۔ شعلے انگاروں کی زد میں تھے، مقناطیس کہربا کے قریب تھا، تبسم، خندۂ زیرِ لب، قہقہے، چبھتے فقرے، حسین طنز، پُرشوق نگاہیں، رنگین نظارے ——— کسی والنٹیر نے خوبصورت لڑکی کو دیکھا اُس کی نگاہیں زبانِ حال سے:۔

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
اک ذرا آپ کو زحمت ہو گی

کہہ رہی تھیں۔ لڑکی کی دُزدیدہ نظروں نے جواب میں کہا بلکہ یوں سمجھئے کہ ترکی بہ ترکی جواب دیا:۔

میں برف بھی ہوں، شبنم نازک مزاج بھی
میری طرف نگاہ، ذرا دیکھ بھال کے

ایک والنٹیر نے کسی لڑکی کے قریب سے گزرتے ہوئے گنگنایا۔

؎ سلامت تری نیچی نیچی نگاہیں
مجھے تو کوئی بدگمانی نہیں ہے

اور اُدھر سے مُسکراہٹوں کے ساتھ "بڑے شریر ہیں آپ" جواب ملا۔

بارُود کی خاصیت ہے کہ وہ گرمی پاکر بھڑک اُٹھتی ہے چقماق کی رگڑ سے شعلے پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تنکے آگ کی حرارت کو بہت جلد قبول کر لیتے ہیں ـــــ یہ قانونِ فطرت ہے۔ روزانہ کا تجربہ اور مشاہدہ کی ہوئی حقیقت ہے ـــــ جوان جذبات میں بارود سے بہت زیادہ آتش گیر مادّہ ہوتا ہے، نگاہِ شباب میں غیر معمولی کشش اور مقناطیسیت ہوتی ہے، جوانی بھول چوک اور لغزشوں سے بچ نہیں سکتی اور جب لغزش کے امکانات اور مواقع موجود ہوں پھر نوجوانی اور پاؤں پھیلاتی ہے۔ شباب ذراسی فرصت، موقع اور تنہائی ملنے پر اخلاق کے ہر مقدس قانون کی خلاف ورزی کرسکتا ہے۔

کانفرنس میں اس قسم کے تمام مواقع اور سہولتیں موجود تھیں۔ قومی رضا کار انسان تھے، فرشتے نہ تھے۔ جوان آدمی کے جذبات کو ذرا سا سہارا ابھی بہت کچھ ہوتا ہے اور کانفرنس میں مشتاق نگاہوں کی حوصلہ افزائی کے لئے ہر طرح کے سہارے موجود تھے۔ اقدام، پذیرائی، جذب و کشش، شوخی و غمزہ، چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق، راز و نیاز ـــــ غرض وہ سب کچھ تھا جس کی جستجو کے لئے جوانی گلیوں گلیوں خاک چھانتی ہے! کسی لڑکے نے لڑکی

کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا :-

"آج آپ بہت دیر سے تشریف لائیں؟"

جملہ بالکل سادہ معمولی تھا - ماں باپ اور بیٹا بیٹی کی روزمرہ کی گفتگو میں یہ جملہ استعمال ہوتا رہتا ہے - مگر جذبات کا اُتار چڑھاؤ، خیالات کا پس منظر، لہجہ اور گفتگو کا انداز، "لفظ" کے معنی بدل دیتا ہے - زبان کیا ہے؟ اظہارِ خیال کا ذریعہ! دل کی بات لفظوں میں ظاہر کی جاتی ہے اس لئے دل کے جذبات و ارادہ کے ساتھ الفاظ کی قدر و قیمت بدلتی رہتی ہے - بات چیت کرنے والے ایک دوسرے کے مافی الضمیر سے آگاہ ہوتے ہیں اس لئے وہ آپس میں اچھی طرح جانتے اور محسوس کرتے ہیں کہ فلاں لفظ کی اہمیت اور قدر و قیمت کیا ہے؟

آپ کا ایک دوست گالیاں دیتا ہے مگر آپ ہنسنے لگتے ہیں - کیوں؟ اس لئے کہ آپ دوست کی نیت اور ارادے سے واقف ہیں - آپ جانتے ہیں کہ کہنے والے کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے - یہ پیار محبت کی باتیں ہیں لہٰذا آپ دشنام آمیز الفاظ کی دُرشتی محسوس نہیں کرتے - مگر آپ کا ایک دشمن آپ کی تعریف کرتا ہے اور آپ برافروختہ ہو جاتے ہیں - کیوں؟ اس لئے کہ آپ اپنے دشمن کی نیت، ارادے اور مافی الضمیر سے اچھی طرح باخبر ہیں - اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ مدح نہیں طنز ہے!

ہاں! تو وائلیٹر کے اس جملہ کو سن کر :-

"آپ بہت دیر سے تشریف لائیں؟

لڑکی سمجھ جاتی ہے کہ کہنے والے نے کس ارادے کے ساتھ یہ الفاظ زبان سے ادا

گئے ہیں اور اِن الفاظ کے پیچھے کس قسم کا جذبہ موجود ہے! خم گردن، اور تبسم زیرِ لب سے اس کا جواب دیا جاتا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں پیام سلام ہو جاتے۔ انتہا یہ ہے کہ "انقلاب زندہ باد" کے نعروں کے زیر و بم میں خاص اشارے مقرر رکھے گئے اور "بندے ماترم" کا ترانہ گاتے وقت اور کچھ کہے بغیر صرف ترانے کے لفظوں میں بات چیت ہو جاتی تھی۔

وہ جو کسی دانائے راز نے کہا ہے ؎

میانِ عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

تو اِن رضاکار مرد عورتوں کے اشارے بھی کوئی نہ سمجھ سکتا تھا۔ ہوس اپنے لئے بہت سی راہیں نکال لیتی ہے اور جذبات سچ مچ ہتھیلی پر سرسوں جما سکتے ہیں۔ آدمی جب بلندی کی طرف مائل ہوتا ہے تو عرش سے آگے نکل جاتا ہے اور ماہ و کہکشاں گرد راہ بن جاتے ہیں اور جب گرتا ہے تو پستی کی آخری گہرائی سے بھی نیچے پہنچ جاتا ہے۔ ہوس انتہائی پستی کی طرف مائل تھی۔

اجلاس کا آخری دن تھا۔ اہم تجویزیں پیش ہو رہی تھیں۔ ایک نوجوان لڑکی ڈائس کے پیچھے گیلری میں اشتہارات لئے کھڑی تھی۔ یہ لڑکی سب سے زیادہ خوبصورت اور صحت مند تھی۔ چھریرا بدن، متوسط قد، کھلتا رنگ، خوب گھنے سیاہ بال ——— والنٹیروں کی سفید وردی نے تو اُس کو اور زیادہ جاذبِ نظر بنا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی پھبن تھی۔ وہ خاموش کھڑی تھی مگر محسوس ہو رہا تھا کہ گنگنا رہی ہے۔ ایک والنٹیر جو اس جماعت کا افسر

معلوم ہوتا تھا۔ بار بار گیلری کی طرف جاتا اور واپس چلا آتا۔ سامعین صدر جلسہ کی اختتامی تقریر سننے میں مصروف بلکہ مستغرق تھے۔

ایک شخص جو ڈائس کے قریب بیٹھا تھا والنٹیر کی نقل و حرکت کو بغور دیکھ رہا تھا۔ والنٹیر اُس کی طرف دیکھتا تو وہ آدمی نگاہیں چرا لیتا گویا اُس نے والنٹیر کو دیکھا ہی نہیں۔ لڑکی قنات کے پیچھے گیس کے ہنڈے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ والنٹیر نے ٹہلتے ہوئے ایک پرچہ زمین پر گرا دیا اور بدستور ٹہلتا رہا۔ لڑکی قدرے توقف کے بعد پرچہ اُٹھانے کے لئے جھکی۔ لڑکی نے پرچہ اُٹھایا ہی تھا کہ وہی شخص جو والنٹیر پر نظر رکھتا تھا تیزی کے ساتھ بڑھا اور لڑکی کے ہاتھ سے پرچہ چھین لیا۔

"خیر تو ہے؟ بھائی صاحب!" لڑکی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ لڑکی کا بھائی پرچہ پڑھنے لگا۔ وہ پرچہ پڑھتا جاتا تھا اور اُس کے چہرہ پر غصہ کی سُرخی دوڑتی جاتی تھی۔ اُس نے بڑھ کر والنٹیر کا گریبان پکڑ کر جھٹکا دیا۔ والنٹیر تیورا کر زمین پہ گر پڑا اُس کا سر ڈائس سے ٹکرایا اور خون کا فوّارہ جاری ہو گیا۔

جلسہ میں شور مچ گیا کہ فساد ہو گیا۔ کچھ لوگ ڈر کے مارے کہ کہیں ہم لپیٹ میں نہ آ جائیں پنڈال چھوڑ کر بھاگ گئے۔ چند لوگوں نے والنٹیر کو سنبھالا اور کچھ نے لڑکی کے بھائی کو پکڑ لیا۔ صدر کو تقریر بند کر دینی پڑی۔ لوگ اُٹھ اُٹھ کر دیکھ رہے تھے اور ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہو گیا؟ ہزاروں آدمیوں کی دھیمی دھیمی آوازیں مل کر اچھا خاصہ ہنگامہ بن گئیں۔ صدر کی فراست نے معاملے کو آگے نہ بڑھنے دیا۔ لڑکی کے بھائی کی تھوڑی سی "تواضع" ہو کر رہ گئی۔ دوسرے

دن اخبارات میں جلی سُرخیوں کے ساتھ خبر شائع ہوئی ا-

مُٹھی بھر لفنگے اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئے -

جلسے کو ناکام بنانے کی منظم سازش -

کپتان مہابیر زخمی ہو گئے -

کانفرنس ختم ہونے کے تیسرے دن معلوم ہوا کہ "زندہ باد" کے نعروں میں تین لڑکیاں غائب ہو گئیں - اور کانفرنس میں والنٹیروں کا یہ مخلوط اجتماع اخلاقی اعتبار سے بہت مضرت رساں ثابت ہوا - آزادانہ اختلاط نے لڑکوں اور لڑکیوں کے جذبات میں آزادی اور بے باکی کا رنگ پیدا کر دیا - غیرت کا جذبہ بہت ہی نازک ہی ذرا سی بے پروائی سے یہ حس مجروح ہو جاتی ہے اور دیدوں کا پانی ڈھل جاتا ہے - دوسرے سال جب کانفرنس کی پھر تیاریاں ہونے لگیں تو شہر کے بعض لوگوں نے کہا کہ آپ آزادی کے لئے مظاہرہ کر سکتے ہیں مگر ہم وہ باتیں نہ ہونے دیں گے جو پچھلے سال وقوع میں آ چکی ہیں - عورتوں کو خدا کے لئے "چراغِ خانہ" ہی رہنے دیجئے "شمع انجمن" نہ بنائیے اگر آپ لوگ نہ مانے تو ہم آپ کے اس اقدام کے مقابلہ میں "ستیہ گرہ" کریں گے - آزادی کے نام پر اپنی ماؤں بہنوں اور بہو بیٹیوں کی بے آبروئی نہ ہونے دینگے -

—— ہوس کاریاں تلملا تلملا کر رہ گئیں !

فساد

بابا! پیسہ! اپنی کمائی کی خیرات، اپنے ہاتھوں کا میل!——
—— بھکاری نے لجاحت آمیز لہجہ میں کہا۔
—— بھیک مانگتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی، ڈومن کی لاش لئے پھرتے ہو، کمایا نہیں جاتا، ہاتھ پیر نہیں ہلتے، حرام کی روٹیوں کا چسکا پڑ گیا ہے، بے غیرت کہیں کا—— اختر نے جھڑک کر جواب دیا اور اپنے ساتھی کے ساتھ فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ بھکاری نے آگے بڑھ کر پھر سوال کیا۔ اس پر اختر اُس کا ہاتھ جھٹک کر بولا۔
—— اگر ایک قدم بھی ہمارے پیچھے تم آئے اور ایک لفظ بھی مُنہ سے نکالا تو پولیس کے حوالے کردوں گا، بھیک مانگتے ہو یا ٹیکس وصول کرتے ہو۔
—— دو وقت کا بھوکا ہوں سرکار!—— بھکاری نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔
—— تو ہم کیا کریں؟ اختر کے ساتھی پرتاب نے جواب دیا۔
—— حضور! کھانا کھلوا دیں—— بھکاری نے کہا

— تمہارے باپ کا قرض آتا ہے ہم پر! —— اختر چیخکر بولا۔

— سرکار! دیا، مہربانی، ہمدردی —— بھکاری نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

— بھوکے ہو تو مزدوری کرو، بورے اُٹھاؤ، سڑک کوٹو، لکڑیاں چیرو، دُنیا میں کام کرنے والے کے لئے بہت سے دھندے ہیں۔ مگر تمہیں تو بھیک کی روٹیوں میں مزہ آتا ہے —— پرتاب جھنجلا کر بولا۔

— ہجور! میرے پیٹ میں پھوڑا نکل آیا ہے (پیٹ دکھاتے ہوئے) کچھ کام کاج نہیں ہو سکتا۔ چلنا پھرنا ہی میرے لئے مشکل ہے —— بھکاری نے جواب دیا۔

— تو تم ہسپتال میں کیوں داخل نہیں ہو جاتے —— اختر کے جواب دینے پر بھکاری کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

— ہسپتال میں تو میں داخل ہو گیا تھا۔ مگر سرکار! وہاں بھی غریبوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ کمپوڈروں کی جو مریض مٹھی گرم کرتا ہے اُس کی اچھی طرح ٹہل اور دیکھ بھال ہوتی ہے۔ جس کے پاس پیسہ نہ ہو وہ پانی کے لئے تڑپتا ہے اور کوئی خدا کا بندہ اُس کے منھ میں پانی کی دو بوندیں نہیں ٹپکاتا ——

بھکاری نے بات ختم کی اور سینما والے باجے کے ساتھ اشتہار بانٹنے لگے۔ دونوں دوست اشتہار پڑھنے میں مصروف ہو گئے! بھکاری دوسرے راہگیروں سے بھیک مانگنے لگا۔

—— ارے بھئی اختر! اس کھیل میں مس سُندری نے کام کیا ہے۔
پرتاب تصویر پر نظریں جما کر بولا۔

—— سُندری نے کام کیا ہے؟ تو بھائی! کچھ ہو جائے آج کھیل دیکھنے ضرور چلیں گے —— اختر نے جواب دیا۔

—— تو یوں کہئے کہ آپ بھی سُندری کے نیازمند عاشقوں میں ہیں؟
—— پرتاب مُسکرا کر بولا۔

—— عاشقی واشقی سے تو بندہ ناواقف ہے! ہاں۔ میں اُس کی اداکاری کو پسند کرتا ہوں۔ جس کھیل میں وہ کام کرتی ہے۔ کوئی ایکٹر یا ایکٹریس اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ سُندری ایکٹریس پیدا ہوئی ہے۔ جذبات کے اظہار پر اُسے غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ فلم انڈسٹری کو اُس پر ناز کرنا چاہئے —— اختر نے جواب دیا۔

—— تم نے تو سُندری کی تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ محبّت آدمی کو شاعر، افسانہ نگار اور مقرر بھی بنا دیتی ہے —— پرتاب نے کہا۔

—— لیکن مجھے اُس سے محبّت نہیں دلچسپی ہے —— اختر جیب میں ہاتھ ڈال کر بولا۔

—— محبّت کا آغاز دلچسپی ہی سے ہوتا ہے اختر! اب تم نے محبّت کی پہلی منزل میں قدم رکھا ہے۔ آگے چل کر محبّت رنگ لائے گی" پرتاب نے کہا۔

—— پھر کیا ہو گا؟ —— اختر نے مزاحیہ انداز میں دریافت کیا۔

—— وہی ہو گا جو عاشقوں کے ساتھ حُسن کی بے نیازی سلوک کیا کرتی ہے! آہیں، نالے، ماتم، فریاد، جُدائی کے دن اور ہجر کی راتیں۔ زرد چہرہ

ویران نگاہیں ۔ غم کی بیماری :-

مریضِ عشق پہ رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

یہاں تک کہ ڈریم کی گھڑ گھڑ میں پرتاب کے لفظ گھل مل کر رہ گئے ——)

—— اپنی بات تو پوری کر پرتاب! —— اختر نے کہا۔

—— میں نے کہا نہ تھا کہ تم سُندری پہ بُری طرح عاشق ہو۔ اب میرے کہنے کی تصدیق بھی تم نے خود ہی کر دی —— پرتاب نے جواب دیا۔

—— وہ کس طرح ؟ —— اختر نے پوچھا۔

—— اس طرح کہ تم اُس ایکٹریس کے ذکر سے لذت لے رہے ہو۔ اور چاہتے ہو کہ یہ ذکر ختم نہ ہو جاری رہے۔ اور سُندری کا نام بار بار لیا جائے! یہ محبت کے آثار نہیں تو اور کیا ہیں ؟ —— پرتاب سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

—— تمہارا وہ جملہ تو ادھورا ہی رہ گیا؟ —— اختر نے کہا۔

—— تو سُنیئے! غمِ عشق کی شدت کے بعد تم بیمار ہو جاؤ گے۔ کوئی طبیب اور ڈاکٹر تمہارے دیکھنے کے لئے آئے گا تو تم زبانِ حال سے کہو گے:-

ازسرِ بالینِ من برخیز اے ناداں طبیب!
دردمندِ عشق را دارو بجُز دیدار نیست

اُس کے بعد نزع کا عالم طاری ہوگا اور اس جانِ آرزو کے انتظار میں دم اٹک اٹک کر آنکھوں میں رہ جائے گا۔ کئی دن اسی عالم میں گزر جائیں گے یہاں تک کہ دیے

ایک ہچکی موت کی تھی اک تمہاری یاد کی
ہچکیوں نے کر دیا بیمارِ غم کا فیصلہ

پرتاب نے جواب دیا۔

—— تو پھر میں مر جاؤں گا؟ —— اختر نے دریافت کیا۔

—— کشتگانِ عشق کہیں مرا کرتے ہیں۔ تم تو بھیا! فنا ہو کر زندۂ جاوید ہو جاؤ گے —— پرتاپ نے اپنی بات ختم کی ہی تھی کہ بازار کے نکڑ کے قریب ایک بھکارن نے صدا لگائی کہ :-

دے خدا کے نام پر دلوا خدا کے نام پر

جوان عورت، گداز جسم، سانولی رنگت، متناسب اعضاء، ملگجے کپڑے اُسے اور زیب دے رہے تھے اور پھٹی چولی نے اُس کی جوانی کو اور زیادہ نمایاں کر دیا تھا۔ پرتاپ اور اختر نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ بھکارن کے اندازِ سوال میں بے نیازی پائی جاتی تھی۔ راہگیر سے سوال کیا اور انتظار کئے بغیر آگے بڑھ گئی۔ دوسرے بھکاریوں کی طرح نہ تو وہ راہگیروں کے آگے ہاتھ جوڑتی اور نہ اُن کا پیچھا کرتی۔ بھکارن کو اپنی جوانی کا پورے طور پر احساس تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی اور یہ اُس کا روزانہ کا تجربہ تھا کہ اُس کے رنگ روپ میں کشش ہے اس لئے بھیک دینے والے از خود اُس کی طرف بڑھیں گے بلکہ متوجہ ہوں گے۔ جوانی جب بھیک مانگ رہی ہو تو کون سنگدل اپنے دل و نگاہ پر قابو رکھ سکتا ہے۔ اب رہا روپیہ، پیسہ تو قلب و نظر کے معاملہ میں ان چیزوں کی کیا حقیقت ہے۔ جس چیز کے حاصل کرنے کے لئے آدمی کا دل چاہے تو اُس کی خاطر آدمی اُدھار لے سکتا ہے۔

راہگیر اُس جوان بھکارن کو بہت شوق کے ساتھ بھیک دیتے۔ دو چار پیسوں میں کئی لذتیں اُن کو مل جاتیں! نظارے کی لذّت، بھکارن کی اُنگلیاں چھونے کا لطف اور اُس سے باتیں کرنے کا چٹخارہ! بھکارن اس بے نیازی کے ساتھ بھیک لے کر انجان ہو جاتی گویا وہ اپنی جوانی کا خراج وصول کر رہی ہے۔ اُس نے کبھی کسی کو دُعا نہیں دی، کسی کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ کسی داتا کی شان میں قصیدہ نہیں پڑھا کہ تم بھاگوان ہو، راجہ ہو، بادشاہ ہو، مُلکی لاٹ ہو! بھکارن کو بخوبی احساس تھا کہ لوگوں کو اُس کی مفلسی اور غریبی سے قطعاً ہمدردی نہیں ہے۔ اگر دُنیا کو افلاس پریشاں حالی سے ہمدردی ہوتی تو اُسی شہر میں بیسیوں لُولے، لنگڑے اندھے اور اپاہج فقیر موجود تھے۔ جو چیختے رہتے اور مشکل ہی سے کسی بندۂ خدا کو پیسہ کوڑی دینے کی توفیق ہوتی۔ یہ لوگوں کی ہمدردی نہیں عیاشی اور ہوس پرستی تھی۔ وہ بھکارن کے افلاس کو نہیں اُس کی جوانی کو نذرانہ دیتے تھے۔ ہوس کا نذرانہ، جذبات کی پیش کش، چٹخاروں کی قیمت، دل چسپی کا معاوضہ، تفریح کی اُجرت!

اختر نے دو آنے اور اُس کے دوست پرتاب نے چونی بھکارن کو دی۔ دونوں کی آنکھیں بھکارن کی تنگ و دریدہ چولی پر جمی تھیں، اِدھر بھکارن نے اُن کے ہاتھ سے پیسے لئے اور اُدھر بوڑھا فقیر جسے دونوں نے سختی کے ساتھ جھڑک دیا تھا وہاں آ گیا۔ اختر اور پرتاب نے فقیر کو دیکھ کر نظریں چُرا لیں۔ فقیر صدا لگاتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ دونوں دوست بازار میں

خرید و فروخت کر کے گھر چلے آئے ۔ اور رات کا کھانا کھا کر سینما ہال پہنچے۔ اس دوران میں بھکارن کا کئی بار ذکر آیا۔ دونوں اُس سے متاثر معلوم ہوتے تھے۔ کسی سے دل چسپی اور تعلقِ خاطر ہونے پر ہی اُس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سینما ہال کے دروازے پر تماشائیوں کی بھیڑ لگی تھی۔ ٹکٹ کی کھڑکی پر تو یہ عالم تھا کہ پچاس آدمی نیچے کھڑے تھے اور دس آدمی اُن کے سروں پر لیٹ کر کھڑکی کی طرف دستِ امید دراز کر رہے تھے۔ اختر اور پرتاپ کو سب سے اونچے درجے کا ٹکٹ لینا تھا اس لئے ٹکٹ لینے میں زیادہ دقّت نہیں ہوئی۔ کھیل شروع ہوا اور تمام تماشائیوں پر سکوت طاری ہو گیا۔ زبانیں خاموش تھیں اور آنکھیں محوِ نظارہ! تماشا بہت دل چسپ تھا۔ شروع سے آخر تک دلچسپی قائم رہی۔ گانے بہت زیادہ دل کش اور سامعہ نواز تھے۔ لوگ سینما ہال سے گیت گاتے اور تعریفیں کرتے نکلے اختر اور پرتاپ راستے میں گفتگو کرتے جا رہے تھے۔

"نوکرانی کا پارٹ جس ایکٹریس نے ادا کیا ہے وہ بھی صاحب! فتنۂ روزگار ہے "

" بلکہ قیامت !"

" اس ایکٹریس کا چہرہ اُس بھکارن کے چہرے سے کتنا ملتا جلتا ہے "

ہیں - اس جگہ تو ہم دونوں کی دلچسپیاں ایک دوسرے کے سہارے قدم بڑھائیں گی - کیا سمجھے ؟"

"جی ! سب کچھ سمجھ گیا"

"تو پھر کامیابی کا سہرا کس کے سر رہے گا ؟"

"دونوں کے سر"

"کیوں ؟"

"اس لئے کہ دلچسپی مشترک ہے (دونوں بہت ہنسنے لگے)"

اختر اور پرتاب دوسرے دن بھکارن کی تلاش میں روانہ ہوئے - پرتاب نے کہا -

"بھئی ! میرے یہاں نوکرانی کی بہت دن سے ضرورت ہے - میری بیمار بیوی کام کرتے کرتے ہلکان ہوئی جاتی ہے - بہن کو پڑھائی سے فرصت نہیں ملتی پھر بھی وہ بیچاری کام کاج میں اپنی بھابی کا ہاتھ بٹاتی ہے - بھکارن بہت صحت مند اور توانا ہے گھر کا سارا کام سنبھال لے گی - اور ہاں ! پانی کا نل میرے گھر کے سامنے ہی ہے وہاں سے پانی بھی لے آیا کرے گی - کہار وقت پر پانی نہیں لاتا جس کی وجہ سے بہت تکلیف ہوتی ہے - بھکارن مل گئی تو اُس سے نوکری کے لئے کہیں گے - شاید وہ راضی ہو جائے "

"تو پھر میں واپس جاتا ہوں ؟" ——— اختر نے کہا -

"یہ کیوں ؟" ——— پرتاب نے دریافت کیا -

"مشابہت کی انتہا ہے کہ ایکٹریس کے سیدھے رُخسار پر بھی تِل ہے۔"

"تم بھی بار بڑے نظر باز ہو کہ جس کو دیکھا بس اُس کا نقشہ آنکھوں میں کھینچ لیا۔"

"مگر تم سے کم!"

"بھئی! اُس بھکارن کے دیکھنے کے لئے طبیعت چاہتی ہے۔"

"تو بھئی کل چلئے!"

"آپ کو بھی ساتھ دینا ہوگا۔"

"ارے صاحب! آپ کی بات میں نے آج تک ٹالی ہے؟ جو نہیں......"

"(بات کاٹ کر) گویا کہ آپ مجھ ناچیز کی خاطر زحمت فرمائیں گے آپ کو بھکارن سے کوئی دلچسپی نہیں؟"

"آپ یہی سمجھ لیجئے۔"

"دیکھو بھئی بہ تاب! صاف صاف بتاؤ اگر تمہارا دل واقعی چاہتا ہو تو میرے ساتھ چلو۔ میرے لئے تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تو تم مجھ سے یہ کہلوانا چاہتے ہو کہ میں تمہارا رقیب ہوں۔"

"(قہقہہ) ارے بھیّا! گلی گلی بھیک مانگنے والی عورت کہیں وجہِ رقابت بن سکتی ہے۔ رقابت اور رشک کے اور موقعے ہوتے

"آپ اُسے نوکر رکھنا چاہتے ہیں تو خود جاکر ڈھونڈیئے، بات چیت کیجئے اور گھر لے آیئے! خوب مزے مزے کے کھانے پکوایئے۔ بات چیت کیجئے۔ آنکھیں لڑایئے۔ میں جاکر کیا کروں گا؟ کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے کرنے سے کیا فائدہ؟" ——— اختر نے جواب دیا۔

"اختر! تم بعض وقت نادانوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہو۔ ارے بھائی! جب وہ میرے یہاں نوکر ہو جائے گی تو تمہیں میرے گھر آنے جانے سے کون روکے گا؟ بات چیت کرنے اور آنکھیں لڑانے کی تم کو اجازت دے دی جائے گی۔ کہو اب تو ساتھ چلو گے؟" ——— پرتاب مسکرا کر بولا۔

"اور تمہاری نیت بدل گئی تو؟" ——— اختر نے پوچھا۔

"تمہاری دلچسپیوں میں کوئی چیز حائل نہ ہوگی، اطمینان رکھو" ——— پرتاب نے جواب دیتے ہوئے تانگے والے کو اشارے سے روکا اور تھوڑی دیر میں دونوں دوست چوراہہ پر پہنچ گئے۔

اتوار کا دن تھا۔ بازار میں کافی بھیڑ تھی۔ لوگ خرید فروخت اور سیر وگشت میں مصروف تھے۔ دفتر والے تو سارے کام کاج اسی دن کے لئے اُٹھا رکھتے ہیں۔ دونوں دوست چوراہہ پر جاکر کھڑے ہوگئے۔ وہاں بہت سے فقیر گھوم رہے تھے۔ مگر اُس بھکارن کا پتہ نہ تھا۔ بہت دیر تک وہ دونوں ادھر اُدھر تلاش کرتے رہے۔ لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

"نہ معلوم ظالم آج کہاں غائب ہو گئی۔ شہر بھر کے فقیر چپرا ہ کے آس پاس گھوم رہے ہیں۔ ایک وہی نظر نہیں آتی" ——— پرتاب نے کہا۔

"ارے بھئی! فقیروں اور بھکاریوں کا کیا اعتبار، جدھر منھ اُٹھا چل دیئے" ——— اختر نے جواب دیا۔ اور راستے میں بوڑھا فقیر صدا لگاتا ہوا اُن کے پاس آگیا۔ پرتاب نے فقیر کو دیکھتے ہی ایک آنہ اُس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

فقیر نے دعاؤں کا دفتر کھول دیا۔ عزّت، آبرو، اور ترقیِ عمر و اقبال کی دعائیں ہر کسی کو اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر پرتاب فقیر سے کچھ کہنا چاہتا تھا اس لئے دُعاؤں کا دیر تک جاری رہنا اُسے پسند نہ تھا۔

"بڑے میاں! اچھے تو ہو؟" ——— پرتاب نے پوچھا۔

"ارے بھئی! ان کا کیا ہے۔ یہ تو بادشاہ لوگ ہیں۔ نہ دُنیا کی کوئی فکر۔ نہ جہان کا غم۔ جو مل گیا کھالیا۔ جہاں نیند آئی لمبے لمبے لیٹ گئے۔ بڑے چین میں کٹتی ہے ان کی زندگی" ——— فقیر کے جواب دینے سے پہلے اختر بیچ میں بول اُٹھا۔

"مجھ غریب کا حضور مذاق بنا رہے ہیں؟ جو آدمی ایک ایک پیسہ کے لئے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہو۔ جس کو دن رات میں ایک وقت بھی پیٹ بھر کھانا نہ ملتا ہو۔ اُسے آپ سُکھی کہہ رہے ہیں؟"

—— نقیر نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر جواب دیا۔
"ارے بھئی! تم نے یہ کیا بحث چھیڑ دی اختر!؟" "ہاں! بوڑھے فقیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے / سے ایک بات پوچھنی ہے۔ چلو! کمپنی باغ کی طرف چلیں! یہاں بازار میں تو کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ سارا شہر آج اسی بازار میں آگیا ہے" —— پرتاب کہتے ہوئے آگے بڑھا۔ اُس کے ساتھ اختر تھا اور اختر کے پیچھے بوڑھا فقیر۔ تینوں میدان میں جا کر رُک گئے۔
"وہ بھکارن آج نظر نہیں آتی؟" —— پرتاب نے نقیر سے پوچھا۔
"کس بھکارن کو پوچھ رہے ہیں سرکار!؟" —— فقیر نے دریافت کیا۔
"ارے بھئی! وہی عورت جو —— (جھجکتے ہوئے) بھیک مانگتی ہے" —— اختر نے کہا۔
"یہاں تو حضور! بیسیوں عورتیں بھیک مانگتی ہیں" فقیر بولا۔
"جوان سی عورت ہے۔ سانولی رنگت۔ آنکھیں کچھ" ——
پرتاب کی بات کاٹ کر فقیر نے پھٹی چادر سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔
"میں سمجھ گیا حضور! مالتی نام ہے اُس لڑکی کا! آج رائے بہادر صاحب کا تلا دان ہے وہ ضرور وہیں گئی ہوگی۔
اس پر اختر بولا۔—

"تم وہاں کیوں نہیں گئے؟ رائے بہادر کے یہاں سیکڑوں کی خیرات بٹے گی!"

فقیر نے حسرت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

"سرکار! وہاں تو جوان آدمیوں کا کام ہے۔ ایک ایک آدمی کو لڑنا پڑتا ہے جب کہیں خیرات بانٹنے والے تک پہنچ ہوتی ہے۔ مجھ غریب کا تو دھکوں ہی میں کام تمام ہو جاتا!"

اختر اور پرتاب تھوڑی دیر تک بوڑھے فقیر سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے کہ تم روزانہ کتنے کی بھیک مانگ لیتے ہو، شہر میں کتنے فقیر ہونگے؟ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اس شہر میں کس طرح آنا ہوا؟"

فقیر نے ایک ایک سوال کا جواب بہت تفصیل سے دیا۔ اتنے ہمدرد بخشش کرنے والے اُسے آج تک نہ ملے تھے۔ انہی باتوں کے دوران میں پھر اُسی لڑکی کا ذکر آگیا اور پرتاب نے جو ملازمت کا تذکرہ کیا تو اس پر فقیر بولا:۔

"میں اُس لڑکی کی ماں سے کہوں گا اور اُسے راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر لڑکی کی ماں اِدھر نہ آئی تو میں خود اُس کے پاس جاؤں گا۔ (پرتاب نے ایک روپیہ فقیر کو دیدیا) تو حضور! بس یہ سمجھئے کہ وہ آپ کے یہاں نوکر ہو گئی۔ اُس کی ماں اُس کے بھیک مانگنے سے تنگ آگئی ہے ذرا شکل صورت کی اچھی ہے۔ سارا بازار اُس لڑکی کے پیچھے پھرتا ہے۔ بُرا زمانہ ہے سرکار! اچھے آدمی کو دوش لگ جاتا ہے!"

اختر نے کہا "اگر تم نے لڑکی کی ماں کو رضا مند کر کے اُسے ہمارے یہاں نوکر رکھوا دیا تو سو روپے تم کو اور دیئے جائیں گے۔"
فقیر کی آنکھوں میں مسرت جھلکنے لگی۔ اُس کے گالوں کی سُکڑی ہوئی جُھریاں خوشی کے مارے تن گئیں۔ اُس نے ان دونوں کو یقین دلایا کہ مالتی کی ماں یقیناً اپنی بیٹی کی ملازمت کے لئے راضی ہو جائے گی۔ اور میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں گا۔
پرتاب نے پوچھا "تو پھر کل اسی وقت ہم تمہارے پاس آئیں؟"
فقیر نے جواب دیا "سرکار! ایک دن تو مجھے کوشش کے لئے ملنا چاہیئے۔ کل میں لڑکی کی ماں کو ڈھونڈوں گا۔ آپ پرسوں شام میں کسی وقت آجائیں۔ میں چوراہہ پہ کھڑا رہوں گا۔ آپ کو مجھے ڈھونڈنے میں ذرا بھی پریشانی نہیں ہوگی۔"
پرتاب اور اختر وہاں سے خوش خوش واپس آئے اور راستہ میں ہوٹل کے بالاخانہ پہ بیٹھ کر گفتگو کرنے لگے:۔
"جب کام بننا ہوتا ہے تو اس طرح غیب سے سامان پیدا ہو جاتے ہیں۔"
"سامان تو غیب ہی سے پیدا ہوئے ہیں مگر اس میں ہمارا جذبِ صادق بھی شامل ہے۔"
"تو کل مالتی تمہارے گھر کی زینت ہوگی؟"
"یہ ابھی سے رشک و رقابت کی باتیں شروع کر دیں تم نے؟"

"اس میں جھوٹ کیا ہے؟"

"مجھے ڈر ہے کہ تمہارے اندیشوں سے ہماری مشترک دلچسپیاں کہیں ٹکرا نہ جائیں"۔

"محبت میں ایسا بھی ہو جاتا ہے"۔

"تو یوں کہئے آپ اُس بھکارن کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ ذرا مجھ سے آنکھیں ملا کر تو بات کیجئے مسٹر عاشق! تمہارے پاس ایک دل ہے کسے کسے دو گے! اور خدا جھوٹ نہ بُلوائے تو کم سے کم دس پندرہ جگہ تم دل دے چکے ہو اور عاشق ہو چکے ہو۔ ہنواڑی کی لڑکی سے تمہیں عشق ہے۔ آم والی پر تم فریفتہ ہو۔ ہولی کے دن ایک عورت کو دیکھ کر تم بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ ہر حسین چہرے کو دیکھکر تمہارا دریائے محبت جوش میں آجاتا ہے"!

"تو آپ مجھے گالی دے رہے ہیں۔ یعنی یہ کہ میں ہرجائی ہوں"۔

"آپ ہرجائی نہیں۔ بس ذرا عشق باز ہیں"۔

"مگر تم بھی اس منزل میں مجھ سے پیچھے نہیں ہو"۔

"اِسے الزامی جواب کہتے ہیں"۔

"میں نے قانون نہیں پڑھا"۔

ہوٹل میں پیانو بجنے لگا۔ اور دونوں دوست تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر چلے آئے۔

پرتاب نے گھر آکر بیوی سے کہا کہ تمہارے لئے آج ایک نوکرانی کا پتہ لگایا ہے۔ پرسوں تک وہ ہمارے یہاں آجائے گی۔ بیوی نے جواب دیا۔

جب میں بیمار تھی اُس وقت تو تم نے یہ کہہ کے ٹال دیا کہ نوکرانیاں پندرہ پندرہ روپیہ تنخواہ مانگتی ہیں۔ ہماری اتنی حیثیت نہیں ہے۔ اب میں ایشور کی کرپا سے اچھی ہوں تو اب میرے کہے بغیر ہی نوکرانی کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

پرتاب اس پر بگڑ کر بولا۔ "اِن عورتوں کی باتیں بھی غضب کی ہوتی ہیں۔ خوش رہنا اور نباہ کرنا تو یہ جانتی ہی نہیں! ان کے فائدے اور آرام کے لئے کوئی کام کرو اُس میں بھی مین میکھ نکال دی جاتی ہے۔ عورتوں نے مردوں کو بدنام کر رکھا ہے کہ ہمیں ستایا جاتا ہے، پامال کیا جاتا ہے۔ ہماری مرضی کی مخالفت ہوتی ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ ہندوستان میں بیویاں نہیں، شوہر مظلوم ہیں۔"

—— پرتاب کی بیوی شوہر کی طبیعت کا رنگ دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ جواب دیتی تو پرتاب دو چار بلائیاں سُنا دیتا۔

تیسرے دن اختر اور پرتاب بازار پہنچے۔ بوڑھا فقیر، مالتی اور اُس کی ماں کے ساتھ دونوں کے انتظار میں کھڑا تھا۔

"ان میاں کو نوکرانی کی ضرورت ہے" —— بوڑھے فقیر نے پرتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مالتی کی ماں سے کہا۔

"سرکار! کس محلہ میں رہتے ہیں؟" —— بوڑھی عورت نے پرتاب سے پوچھا۔

"چھوٹی بزریا میں" —— پرتاب نے جواب دیا۔

"جینیوں کے مندر کے پاس؟" —— بڑھیا نے دریافت کیا۔

"مندر سے کوئی پچاس قدم کے فاصلے پر ہوگا میرا مکان" —— پرتاب

جواب دیتے ہوئے چلنے لگا۔ بازار میں لوگ اس کو نگاہِ غور سے دیکھ رہے تھے۔ بھکارن کا وہاں کھڑا ہونا اپنی جگہ خود ایک تماشا تھا۔ پرتاب نے وہاں کھڑے کھڑے بات چیت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ سب لوگ کمپنی باغ کے سامنے کے میدان میں پہنچے۔

"بڑھیا (مالتی کی ماں):۔ آپ کے گھر میں کتنے آدمی ہیں؟"

"پرتاب:۔ ایک میں دوسری میری بہن اور تیسری بیوی۔ ہم سب مل کر بس تین آدمی ہیں۔"

بڑھیا:۔ "کوئی بچّہ نہیں ہے آپ کے؟"

پرتاب:۔ (متاثر ہو کر) ایک بچّہ تھا دیوالی پر ایشور نے اٹھا لیا۔"

فقیرا:۔ "سرکار! دل میلا نہ کریں خدا نے چاہا تو اتنے بچّے ہوں گے کہ آپ کھلاتے تھک جائیں گے۔"

اختر:۔ "خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔"

تھوڑی دیر تک تنخواہ پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر دس روپے ماہوار اور کھانے پر بات کا تصفیہ ہو گیا۔ تنخواہ طے ہو جانے پر بڑھیا نے کہا:۔

"میں اپنے کنبے کی لاج آپ کو سونپ رہی ہوں۔ مجھ دکھیاری کی عزت آبرو کا خیال رہے سرکار! اور ہاں حضور! مالتی آپ کے گھر دن کے وقت کام کرے گی۔ دن چھپے اسے چھٹی دے دیا کیجئے۔ رات کو وہ اپنے گھر رہے گی۔"

پرتاب نے جواب دیا:۔ تم اپنی لڑکی کی طرف سے بے فکر رہو۔ کوئی آنکھ اٹھا کر بھی اسے نہیں دیکھ سکتا (اختر کھانسنے لگا) تمہاری مرضی کے

مطابق اُسے شام ہونے ہی چھٹی دے دی جائے گی۔ ہمارے یہاں بہت خوش رہے گی تمہاری لڑکی!"

اختر نے کہا کہ آج شام میں تم لوگ خود چل کر پرتاپ کا مکان دیکھ لو۔ کل صبح سے مالتی نوکری پر آئے گی۔ "ارہاں بھئی پرتاپ! دو چار روپے بڑھیا کو پیشگی دے دو۔ تنخواہ میں وضع کر لینا۔

پرتاپ نے چار روپے بڑھیا کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور بڑھیا نے خوش ہو کر مٹھی باندھ لی۔

"اماں! کل تو پنڈاجی کے یہاں ڈسٹون ہے۔ کھانا بھی ہوگا اور بھکاریوں کو دان بھی دیا جائے گا، پرسوں سے نوکری کا معاملہ رہے تو اچھا ہے" —— مالتی نے کہا۔

"تم اب بھکارن نہیں رہیں مالتی! تم نوکرانی ہو۔ تم اپنی کمائی سے اب فقیروں کو بھیک دے سکتی ہو، بھیک بہت ذلیل پیشہ ہے۔ آج سے تمہاری یہ ذلت دور ہوگئی۔ خدا کا شکر ادا کرو۔ پرتاپ کو دعائیں دو کہ تمہیں دردر کی بھیک سے بچا لیا۔ بھیک مانگنے کا خیال ہی چھوڑ دو" —— اختر نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک تو کہہ رہے ہیں میاں! کُتے کی عزت ہوتی ہے اور بھکاری کی عزت نہیں ہوتی! ہاتھ پاؤں کی محنت سے کمائی کی بات ہی اور ہے۔ کل سویرے تم (مالتی کی طرف مخاطب ہو کر) ان (پرتاپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کے یہاں نوکری پر جانا اور خوب دل لگا کر کام کرنا۔ سرکار خوش ہوگئے تو تنخواہ بھی

بڑھا دیں گے ؟" ——— بُڑھیا کرُنہ کا دامن تھام کر بولی۔
" یہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تمہاری لڑکی کا کام دیکھ کر تنخواہ بڑھا دی جائے گی۔ کام کرنے والے نوکر کو ہر کوئی خوش رکھنا چاہتا ہے " ———
——— پرتاپ نے جواب دیا۔ اور چاروں آدمی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اختر نے چپکے سے دو روپے بوڑھے فقیر کی جیب میں ڈال دیئے۔ پرتاپ اور اختر لڑکی کی ماں پر اپنی پارسائی کا سکّہ جمانے اور اُسے مطمئن کرنے کے لئے مانگنی کی طرف دیکھتے بھی نہ تھے۔ وہ اُس سے دُور دُور چل رہے تھے۔ مکّار ہوس موقع دیکھ کر ضبط اور بے صبری کے بھیس بدلتی ہے اور یہ موقع بے صبری کا نہیں " ضبط "، بے نیازی، بناوٹ اور رکھ رکھاؤ کا تھا۔
اختر راستہ سے اپنے گھر چلا گیا۔ اور پرتاپ بُڑھیا اور اُس کی بیٹی کو لے کر مکان پہنچا۔
" یہ لو تمہارے لئے نوکرانی لایا ہوں " ——— پرتاپ نے بیوی سے کہا۔
" شکریہ! یہ ہے وہ نوکرانی ؟ تم نے کل جس کا ذکر کیا تھا " ———
بیوی بُڑھیا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
" یہ تو نوکرانی کی ماں ہے " ——— پرتاپ نے جواب دیا۔
" میں سمجھی نہیں " ——— بیوی نے کہا۔
" یہ کوئی ایسا پیچیدہ مسئلہ تو نہیں ہے جو تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے اس لڑکی کو جو تمہارے سامنے کھڑی ہے میں نے نوکر رکھا ہے اور یہ بُڑھیا اُس کی ماں ہے " ——— پرتاپ قدرے جھنجلا کر بولا۔

"یہ بڑھیا کہیں دوسری جگہ نوکر ہے ؟" —— بیوی نے دریافت کیا۔

"جی! یہ بڑھیا کالج میں پروفیسر ہے اور پڑھانے سے جو وقت بچتا ہے تو اُس میں یہ ہوائی جہاز اُڑاتی ہے۔" —— پرتاپ نے خفگی آمیز لہجہ میں جواب دیا۔

"تم تو میری بات کا بُرا مان گئے۔ میں نے یہی تو پوچھا تھا کہ یہ بڑھیا کہیں نوکر ہے کیا ؟ اس میں بُرا ماننے اور بگڑنے کی کیا بات تھی۔" —— بیوی نے دلگیر ہو کر کہا۔

"اتنی بوڑھی عورت سے کوئی شریف آدمی خدمت لے سکتا ہے! آخر انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے! اس بڑھیا کے ہاتھوں کی جھریاں گنی نہیں جا سکتیں بڑھاپے نے کمر جھکا دی ہے بچاری کی!" —— پرتاپ جواب دیتے ہوئے کپڑے اُتارنے کے لئے اندر کمرے میں چلا گیا۔ بیوی بڑھیا سے باتیں کرنے لگی۔

"کیا نام ہے اس لڑکی کا ؟"

"مالتی"

"ابھی تک بیاہ نہیں ہوا اس کا ؟"

"(ٹھنڈی سانس لیکر) اس کا بیاہ تو بالک پن میں ہی کر دیا تھا۔ پربھاگ کی ہیٹی نکلی یہ لڑکی! بیاہ کے تین سال پیچھے پتی کا دیہانت (انتقال) ہو گیا۔"

"پھر تم نے اس کا دوسرا بیاہ نہیں کیا ؟"

"ہمارے یہاں بیوہ کا بیاہ نہیں ہوتا مالکن! کوئی ایسا کرے تو اُسے جات (ذات) باہر کر دیا جائے۔"

"مگر جوان لڑکی کا دوسروں کے یہاں نوکری کے لئے اس طرح چھوڑ دینا

بھی تو اچھا نہیں ہے بڑھیا!"

"پیٹ کے لئے آدمی کو سب کچھ کرنا پڑتا ہے! اور آپ جیسے بھلے مانسوں اور شریفوں کے یہاں نوکری کرنے میں کوئی برائی نہیں اور......"

اتنے میں پرتاب کپڑے اُتار کر صحن میں آگیا اور بڑھیا کی بات ادھوری رہ گئی۔ تھوڑی دیر بات چیت کے بعد بڑھیا اپنی لڑکی کے ساتھ یہ کہہ کر چلی گئی کہ صبح سویرے ماتنی آپ کے یہاں آئے گی اور یہ کل سے آپ کی نوکر ہوگی اور اس کے اَن داتا اور مائی باپ آپ ہی ہیں۔

پرتاب نے کہا "تم ہر طرح سے مطمئن اور بے فکر رہو۔ تمہاری لڑکی کو ہمارے یہاں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ اُن کے جانے کے بعد میاں بیوی میں گفتگو ہونے لگی۔

"یہ بڑھیا کہاں کی رہنے والی ہے؟"

"اسی شہر میں گھر ہے اُس کا!"

"کس محلہ میں؟"

"یہ میں نے نہیں پوچھا"

"آپ کو تمام حالات معلوم کر کے اُس کو نوکر رکھنا تھا"

"اس لڑکی کا جنم پترا اور اُس کے گھر کا جغرافیہ معلوم کرنے کی آخر ضرورت کیا تھی؟"

"اس لئے کہ آج کل نوکرانیاں ہاتھ کی سچی نہیں ہوتیں"

"تمہارے گھر میں کیا چاندی سونے کی اینٹیں بکھری پڑی ہیں جو وہ اُٹھا لے جائے گی؟"

"میں نے یہ کب کہا تھا کہ ہمارے گھر میں روپیہ پیسہ کی تجوریاں بند ہیں؟"
"پھر تمہیں ایک انتہائی دیانت دار نوکرانی کی تلاش کیوں ہے؟"
"بد دیانت نوکرانی کو کوئی بھی اپنے گھر رکھنا پسند نہیں کرتا۔"
"مگر تم اُس بیچاری لڑکی سے اتنی بدگمان کیوں ہو۔ تم نے اُس کو ایک دن بھی نہیں برتا۔ وہ ایک گھنٹہ بھی تمہارے راج محل (طنز آمیز لہجہ میں) میں نہیں رہی۔ اور تم ہو کہ بدگمانیوں کے قلعے کھڑے کر رہی ہو۔"
"(موضوع بدل کر) سُنا ہے اس لڑکی کا بالک پن میں بیاہ ہو گیا تھا۔"
"ہو گیا ہو گا۔ تمہارے کانوں کو میں جھُٹلا نہیں سکتا۔"
"اور یہ چھوٹی عمر میں بیوہ بھی ہو گئی۔"
"اس کی بھی تمہیں کو خبر ہو گی۔"
"لڑکی کی ماں کہہ رہی تھی۔"
"تم نے پوچھا ہو گا؟"
"جی ہاں!"
"(ترش رو ہو کر) تمہاری باتیں اب میرے لئے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہیں۔ تمہارے آرام کے لئے میں نوکرانی تلاش کر کے لایا ہوں اور تم نے اُس میں ہزار باتیں نکال دیں۔ تمہارے سوالات اس انداز کے ہیں جیسے کسی مُلزم پر وکیل جرح کرتا ہے۔ میری کھلی باتیں بھی اب تم کو بُری لگتی ہیں۔"
پرتاب کی بیوی نے شوہر کی برافروختہ مزاجی دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی

وہ جواب دیتی تو بات بڑھ جاتی اور پرتاب نہ جانے کیا کر بیٹھتا! اس لئے کہ اُس غریب نے آج کی برابر پرتاب کو کبھی برہم نہیں دیکھا تھا۔ پرتاب مالتی کے خلاف ایک لفظ بھی سُننا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کی زندگی۔ حالات، وطن، پیشہ اور دوسری باتوں کے بارے میں ایک لفظ بھی بیوی کا پوچھنا اُسے انتہائی ناگوار تھا۔ پرتاب کی بیوی شوہر کی طرف سے بدگمان نہ تھی اور نہ وہ بیچاری خواہ مخواہ تہمتیں تراش کر لڑائی مول لینے کی خوگر تھی۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ مالتی کی صورت اور پرتاب کی نگاہیں دیکھ کر بیوی کے دل کی تار برقی کا بٹن کسی آنے والے خطرے نے کھٹ سے دبا دیا۔ اور وہ غیر شعوری طور پر فکرمند ہو گئی۔ اس اندیشہ و فکر کے اسباب سے وہ قطعاً بے خبر تھی۔ لیکن دل آپ ہی آپ کچھ سوچ سوچ کر پریشان سا ہوا جا رہا تھا۔

مالتی دوسرے روز صبح سویرے پرتاب کے یہاں آئی۔ پرتاب کی بیوی نے اُسے سمجھا دیا کہ فلاں فلاں کام تمہیں کرنے ہوں گے! ہمارے گھر کا یہ دستور ہے! اس انداز پر لوگ رہتے ہیں! اُس کے سمجھانے کا انداز مشفقانہ اور ہمدردانہ تھا۔ جس میں رُعب و تحکّم کی جھلک بھی نہ تھی۔ مالتی ذہین تھی وہ چند دن میں کاموں کی تفصیل نہ صرف سمجھ گئی بلکہ اُس نے سب کچھ کر کے دکھا دیا۔ بیوی کی بدگمانی اور اندیشوں کو دور کرنے کے لئے پرتاب نے بہت زیادہ ضبط و احتیاط سے کام لیا۔ ہوسناک نگاہیں انجان بن کر مالتی کو کبھی کبھار دیکھ لیتیں۔ پرتاب کے انداز میں لڑکی سے بے تعلقی

پائی جاتی تھی - لڑکی کا جواب بہت ہی مختصر لفظوں میں دیتا اور وہ بھی اُکھڑے اُکھڑے انداز میں - جیسے کسی کو کسی سے دلچسپی اور تعلقِ خاطر نہیں ہوتا - اختر اور پرتاب میں پہلے ہی بات چیت ہو چکی تھی کہ تم چند دن ہمارے یہاں کم آنا اور جب آؤ تو مالتی سے اظہارِ دلچسپی نہ کرنا - میری بیوی کچھ بدگمان سی ہو گئی ہے - اگر ہماری طرف سے ذرا سی بھی بے عنوانی ہوئی تو قیامت آجائیگی بدگمانی کا جوالا مکھی گرمیِ اندیشہ سے شعلہ در وہاں ہو جاتا ہے - ہمیں احتیاط کے ساتھ قدم بڑھانا ہوگا - اناڑی شکاری کی گھبراہٹ اور جلدی سے پھنسا ہوا شکار نکل جاتا ہے - جذبات کو چندروز تھامنے اور شوقِ تیز گام کو روکنے کی ضرورت ہے - بیوی کو مطمئن بنانا اس منزل کا پہلا مرحلہ ہے اگر یہ طے ہو گیا تو پھر آسانیاں ہی آسانیاں، لطف ہی لطف اور مزے ہی مزے ہیں -

ہوس بہت دن تک انتظار نہیں کر سکتی - بے صبری اور عجلت اُس کی فطرت کا خاصہ ہے - اختر اور پرتاب نے چند دن جو اس عالم میں گزارے یہ بھی اُن کا کمال اور مہربانی تھی - پرتاب کی بیوی آدمی تھی اور آدمی کو زیادہ کامیاب طریقہ پر شیطان نہیں آدمی ہی دھوکا دے سکتا ہے - شیطان کا فریب پہچان لیا جاتا ہے - اور آدمی کے دامِ تزویر کا طلسم بہت دن میں جا کر ٹوٹتا ہے - پرتاب نے اب پر پُرزے نکالنے شروع کئے - مالتی اُسے پانی کا گلاس دیتی تو وہ اُس کی انگلیوں کو چھونے کی کوشش کرتا - اختر اُس کے یہاں ہوتا اور مالتی اختر کے قریب سے گزرتی تو وہ مالتی کو مخاطب کر کے کوئی ہنسی کی بات کہہ کر اُسے چھیڑتا -

مالتی ان تمام باتوں کو گوارا کرتی گئی اور اختر و پرتاب کے کسی ایک اقدام پر بھی اُس نے برہمی کا اظہار نہیں کیا ۔ زیادہ چھیڑ چھاڑ پر کبھی کبھار اُس کے تیور خشمناک ہو جاتے ۔ لیکن اس خشمناکی میں بھی سپردگی اور پذیرائی جھلکتی تھی ۔ ـــــــ بہت سے انکار اقرار انگیز اور بہت سے عتاب رضا آمیز ہوتے ہیں ۔

پرتاب کی بیوی شوہر کی طرف سے بدگمان تو نہ تھی ۔ مگر اُس کے طور و طریق نے بے چاری کو اُلجھن میں ڈال دیا ۔ وہ تنہائی میں پہروں سوچتی ـــــ کل وہ (پرتاب) مالتی کو دیکھ کر مسکرائے تھے اور مالتی بھی تبسّم زیرِ لب کے عالم میں کچھ رسمسا کے رہ گئی ؟ پرسوں اُنہوں نے مالتی کے ہاتھ سے پانی کا کٹورا خاص انداز کے ساتھ لیا ۔ جیسے کوئی کسی کے جسم کو چھونا چاہتا ہو ۔ صبح وہ چھپ کے سے مالتی کو جھانک کر دیکھ رہے تھے ۔ شام میں اُنہوں نے مالتی کو بڑے محبّت آمیز لہجہ میں آواز دی ۔ کوئی شخص نوکروں اور نوکرانیوں کو اس انداز سے خطاب نہیں کرتا ۔ اور یہ اُن کا دوست اختر جب بھی ہمارے یہاں آتا ہے تو مالتی کو بار بار بیٹھک میں بلایا جاتا ہے کہ پانی دے جاؤ ۔ پان لاؤ ۔ فلاں کتاب کی ضرورت ہے ۔ آج کا اخبار لے آؤ ۔ یہ کام کرو ۔ وہ کام کرو ۔ کرسی ڈھنگ سے نہیں رکھی ہے ۔ میز پوش گرد آلود ہو گیا ۔ تصویروں کے فریم خراب اور میلے ہوئے جا رہے ہیں ـــــــ اُس کا دماغ انہی تصوّرات میں غلطاں و پیچاں رہتا ۔

آدمی کو غالبؔ نے "بجائے خود" ایک "محشرِ خیال" بتایا ہے ۔ آدمی

دل ہی دل میں اپنے خیالات کی تائید اور تردید کرتا رہتا ہے - تائید و تردید موافقت و اختلاف اور رد و قبول کا یہی سلسلہ شاخ در شاخ ہو کر ایک "مسئلہ" بن جاتا ہے جس پر آدمی غور و فکر کی ضرورت محسوس کرتا ہے مسائلِ حیات کی چھان بین - غور و فکر...... اور جانچ پڑتال میں ہر آدمی کو بعض وقت ارسطو اور بعض دفعہ افلاطون بننا پڑتا ہے - یعنی کبھی وہ جزئیات اور تفصیلات سے نتائج مستخرج کر کے کلیہ قائم کرتا ہے اور کبھی ابتدائی خیال کو سامنے رکھ کر اُس کے تجزیہ سے تفصیلات تک پہنچتا ہے - پرتاب کی بیوی بھی کش مکشِ خیال کے اسی عالم سے گزر رہی تھی - وہ دل کو مطمئن کرنے کے لئے سوچتی - وہ (پرتاب) ایک بھکارن اور اپنے یہاں کی نوکرانی سے دل چسپی نہیں رکھ سکتے - اتنی گراوٹ اُن میں آ ہی نہیں سکتی وہ بہت شریف اور بلند خیال ہیں ہنسنے مسکرانے اور مذاق کرنے کی عادت ہے - اسی لئے تو اُن کی باتیں بظاہر چھیڑ چھاڑ نظر آتی ہیں ——— مگر دوسرا خیال اس خیال کی فوراً تردید کرتا کہ جب اُنھیں (پرتاب کو) اُنتی سے دل چسپی نہیں ہے تو وہ اُسے خاص نظروں سے بار بار دیکھتے کیوں ہیں؟ اُس کے کام کاج کی بار بار تعریف کس لئے کرتے ہیں؟ یہ دل چسپی نہیں تو اور کیا ہے؟ تعلقِ خاطر آخر اور کس چیز کا نام ہے؟ شوق و دل چسپی ظاہر کرنے کے لئے خون تو نہیں بہایا جاتا - باتیں اور رنگ ڈھنگ سے ہی دل چسپی و شوق کا اظہار ہوتا ہے -

پرتاب کی بیوی نہایت خاموشی کے ساتھ شوہر کی نقل و حرکت کو

دیکھ رہی تھی - بیوی کی خموشی نے پرتاپ کی ہمت اور بڑھا دی - وہ یہ سمجھا کہ بیوی اُس کی طرف سے بالکل مطمئن ہے اور اُس کی ہوسناکی کو شک و شبہ کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا رہا ہے - اس اطمینان کے بعد پرتاپ اور زیادہ شوخ چشم ہو گیا - مالتی نے شہر کی گلیوں کی ہوا کھائی تھی وہ دو نوجوانوں کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر خوش ہو گئی - ہوس جذبات کے سہارے بڑھ رہی تھی - اور شوق و دلچسپی کا پیام اب آنکھوں کی حد سے آگے بڑھ چکا تھا - بیوی نے ایک دن آخر پرتاپ کو ٹوک ہی دیا -

"آپ کے دوست اختر نے کیا ملازمت چھوڑ دی ؟"

"تمہیں کس طرح معلوم ہوا ؟"

"اُن کا زیادہ وقت آپ کے ساتھ گزرتا ہے ۔"

"اور تمہیں یہ ناگوار ہے ؟"

"جی ! ایسا تو نہیں ہے ۔"

"ایسا نہیں ہے تو اس ذکر کے چھیڑنے کی آخر کیا ضرورت تھی ؟"

"آپ سے باتیں کرنے کو دل چاہتا تھا ۔"

"تو یہ نشتر چبھو کر مسکرانا اور مذاق اُڑانا تمہارا ہی حصّہ ہے ۔"

"آپ تو بالکل بھرے ہی بیٹھے تھے ۔"

"پہل تم نے کی ۔"

"اور آپ نے اُسے انجام تک پہنچا دیا ۔"

"بہرحال میں اپنے دوست کے بارے میں ایک حرف بھی سُننا نہیں چاہتا ۔"

ابھی تک نرم گفتگو ہو رہی تھی اور پھر دونوں طرف سوال و جواب کی کشا کش سی ہونے لگی۔ پرتاب کی بیوی نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ تمہارا دوست اختر تمہاری بیٹھک میں مالتی کو بلا کر چھیڑتا ہے۔ اُس سے مذاق کیا جاتا ہے۔ شریفوں کے یہاں ایسی باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔ پرتاب نے جواب دیا کہ تم میرے دوست پر تہمت جوڑ کر اُسے ناحق بدنام کرنا چاہتی ہو۔ وہ میرا لنگوٹیا یار ہے۔ میں اُسے چھوڑ نہیں سکتا ——— میرے اور اختر کے تعلقات تمہاری خفگی سے اور استوار ہوں گے کمزور نہیں ہو سکتے۔

ہوسنا کی کو جس قدر مواقع ملتے جاتے ہیں اُسی قدر وہ شوخ، بے حیا اور عیار ہوتی جاتی ہے۔ ہوس پرست، لوگوں کی روک ٹوک، طعن و تشنیع اور کہنے سننے سے اور ضدی ہو جاتا ہے۔ اختر اور پرتاب جذبات کی اُس منزل میں تھے جہاں زندگی صرف چٹخارہ اور لذت ہو کر رہ جاتی ہے۔ پرتاب پہلے پہل تو بیوی کی بدگمانی سے ڈرتا تھا۔ لیکن اب اسکی یہ جھجک دور ہو گئی تھی۔ مالتی اس فتنہ کو روک سکتی تھی مگر اُس نے ہر اقدام کو خوش آمدید کہا اور ہر چھیڑ چھاڑ کو اپنی عزت سمجھا۔

ایک دن پرتاب کی بیوی نے مالتی کو ٹوکا اور دبی زبان سے نصیحت کی تو وہ مانجھے پر سلوتیں ڈال کر بولی کہ مجھے تو سرکار (پرتاب) نے نوکر رکھا ہے وہ جو کچھ کہیں گے اُن کا حکم مانوں گی۔ بیوی نے جواب دیا کہ میں اُن کی بیوی اور گھر کی مالکہ ہوں۔ میرے ہی آرام اور ہاتھ بٹانے کے لئے تو تجھے نوکر رکھا گیا ہے۔ میری بات تجھے ضرور ماننی ہوگی اور میں جو کچھ کہتی ہوں اُس میں تیری بھلائی ہے۔ میری

باتوں کی نخیص قدر کرنی چاہئے —— مگر مالتی وعظ و پند کی سرحد سے کوسوں دُور نکل چکی تھی۔ پرتاب کی بیوی کی باتیں اُس پر کیا اثر کرتیں! موم لوہے پر تھوڑی دیر کے لیے چپک تو سکتا ہے مگر اُسے نرم نہیں بنا سکتا۔ ضمیر جب سخت ہو جاتا ہے تو ملامت کرنے والوں کی ملامت بھی اثر نہیں کرتی۔

برسات کی شام تھی۔ بادل برس کر کھُل چکا تھا۔ کہیں کہیں بہت ہی ہلکے پھُلکے ابر پارے فضا میں تیر رہے تھے۔ اختر اپنے مکان سے پرتاب کے یہاں آیا۔ مالتی کو آواز دی گئی۔ بیٹھک کا دروازہ کھُلا۔ اُن دونوں میں کچھ دیر بات چیت ہوتی رہی۔ دبی دبی باتیں بھنچے بھنچے فقرے۔ زیادہ اشارے! دونوں کی گفتگو اشاروں اور تیوروں سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اسکیم تیار ہو رہی ہے —— زنانہ دروازے سے چند عورتیں پرتاب کی بیوی سے ملنے کے لئے آ گئیں اور مالتی کو بازار جانا پڑا۔ اختر جلد جلد انگلیاں چٹخا رہا تھا —— اس انداز کے ساتھ کہ انتظار کی ساعتیں بس اب ختم ہوا چاہتی ہیں وہ تھوڑی دیر بعد بیٹھک کے قریب کے زنانہ کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں روشنی نہ تھی۔ خانہ داری کا اسباب اِدھر اُدھر پھیلا ہوا تھا۔ اختر نے آنے والے کی پہلی سُنی اُس کے کانوں میں رس پڑنے لگا۔ اُس کی باہیں شدتِ مسرت سے کانپنے لگیں۔ پیروں کی چاپ بہت قریب ہو گئی —— اختر نے آنے والے کا بازو تھاما ہی تھا کہ ایک خوفزدہ چیخ نے سارے گھر کو دہلا دیا۔ مہمان عورتیں بھاگ کر آئیں۔ مکان کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ محلے کے لوگ اکٹھا ہو گئے۔ اختر پکڑا گیا۔

یار لوگوں نے اس واقعہ کو فرقہ وارانہ رنگ دیدیا۔ مسلمانوں کے محلہ میں یہ خبر مشہور کی گئی کہ اختر کو چند متعصب ہندوؤں نے پکڑ لیا ہے وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تقریب عید

کی لڑائی کا انتقام لے رہے ہیں۔ ہندوؤں میں یہ افواہ گشت لگا رہی تھی کہ ایک مسلمان نوجوان سرِ شام فلاں ہندو کے گھر میں گھسکر بیٹھ گیا اور گھر والی پر ہاتھ ڈالدیا۔ افواہوں نے خیالات میں یکایک انقلاب پیدا کر دیا۔ جڑے ہوئے دل ٹوٹ گئے۔ اور ربط و اتحاد کا شیرازہ ذرا سی دیر میں بکھر گیا۔ اس خبر کے مشہور ہوتے ہی نعروں اور گالیوں سے لیکر ہر ایذا پہنچانیوالی چیز استعمال کی گئی۔ شہر میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ دونوں فریق یہی سمجھتے تھے کہ ہم حق کی حمایت کر رہے ہیں۔ پرتاب کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ افواہوں کی گرم رفتاری نے افہام تفہیم کا موقع ہی نہیں دیا۔ پرتاب سخت مشکل میں تھا۔ اگر یہ کہتا کہ اختر اُسکی نوکرانی مالتی کے لئے وہاں چھپ کر بیٹھا تھا تو خود اُسکی ذات پر حرف آتا۔ واقعہ کو جھٹلانا بھی ناممکن تھا۔ اس حادثہ کی کوئی دوسری توجیہہ ہو ہی نہیں سکتی تھی ——— دونوں دوست فساد کی لپیٹ میں آگئے۔

مالتی یہ رنگ دیکھ کر غائب ہو گئی۔

پولیس نے فساد کے وقت تو تماشائی کا مختاط فرض انجام دیا۔ مگر خون خرابہ ہو چکنے کے بعد اُس کی طاقت حرکت میں آگئی۔ اتنے لوگ پکڑے گئے کہ فولادی ہتھکڑیاں ختم ہو گئیں اور رسیوں میں بلوائیوں کو باندھا گیا ——— اختر اور پرتاب دو سو کر لوگوں کے ساتھ پولیس کے نرغہ میں بازار سے گزر رہے تھے اور بوڑھا فقیر اپنے نہ بدلنے والے انداز میں بھیک مانگ رہا تھا۔ دونوں نے فقیر کو دیکھا اور اُن کی آنکھیں زمین میں گڑ کر رہ گئیں۔

———))؛؛؛((———

تلاشِ حقیقت

ریاست لُوچین قدیم کی ارضِ مقدس اور اہلِ چین کی زیارت گاہ تھی اس لئے کہ اُنکا پیغمبر کنفوشس اسی ریاست میں پیدا ہوا تھا۔ ریاست لُو کے مرکزی مستقر سے تقریباً ۲۵۰ لی (چینی میل جو ۶۵۴ گز لمبا ہوتا ہے) کے فاصلہ پر طاسو کا وطن تھا۔ طاسو کو چینیوں کے سب سے بڑے ریفارمر سے غیر معمولی عقیدت تھی اسی لئے وہ کنفوشس کے پیغام کا مفسر ہی نہیں مبلّغ بھی تھا۔ اُسکی تبلیغ میں بے پناہ جوش اور تفسیر اقوال میں غیر معمولی صداقت و عقیدت پائی جاتی تھی۔ اُس نے اپنے مکان کی دیواروں پر کنفوشس کے اقوال کندہ کرائے تھے۔ اُن میں سے ایک قول یہ بھی تھا: "گلی ہوئی لکڑی پر منبت کاری نہیں ہو سکتی" اُس کا گھر ارشاداتِ کنفوشس کا مرقع تھا۔ طاسو کا لوگ احترام کرتے تھے۔ اس احترام کے بہت سے اسباب تھے۔ مذہبی جوش، خلوصِ عمل، پاکیزگیِ کردار، وسعتِ علم اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُسے کنفوشس سے غیر محدود عقیدت اور محبت تھی۔ وہ جس گلی سے گزرتا لوگ تعظیم کیلئے کھڑے ہو جاتے۔ طاسو صاحبِ ظرف اور بلند خیال تھا۔ شہرت، عزت اور قبول عام کے تمام احساسات اُس کی عالی ظرفی میں سما کر رہ گئے۔ ان باتوں نے اُسکی گردن میں خمِ غرور پیدا نہیں کیا۔ احترام و عقیدت کے مظاہرن نے اُسکو منکسر المزاج بنا دیا تھا۔ طاسو کی شانِ انکسار کو دیکھکر مخلوق اُس کی اور گرویدہ ہو گئی کہ یہ شخص شہرت و نمود کی جوئے کم آب نہیں بلکہ شرافت و عالی حوصلگی کا بحرِ ذخار اور دریائے بے ساحل ہے۔

طاسو پیدائشی مقرر تھا۔ اُس کی تقریر میں بلا کی دل کشی اور قیامت کی جاذبیت تھی ارباب نقد و نظر کہتے تھے کہ طاسو تقریر نہیں جادو کرتا ہے! فصاحت، صداقت کے ساتھ مل کر معجزہ بن جاتی ہے اور طاسو کو قدرت نے یہ اعجاز ودیعت فرمایا تھا۔ وہ کئی کئی گھنٹے مسلسل بولتا مگر سننے والے ذراسی بھی گرانی اور بے کیفی محسوس نہ کرتے۔ سامعین کے باطنی جذبات، دلی کیفیات اور رجحانات کا وہ بہت بڑا نبض شناس تھا اور ماہر نفسیات مقرر کسی مجمع میں بھی ناکام نہیں رہ سکتا۔ ناکامی تو اُن مقرروں کے حصہ میں آتی ہے جو ہر اجتماع اور ہر جلسہ کو ایک ہی انداز سے مخاطب کرتے ہیں اور اپنے طرز گفتار اور اسلوب تقریر میں تنوّع پیدا نہیں کر سکتے اور طاسو کا یہ عالم تھا کہ اہل علم کے مجمع میں پورے عالمانہ وقار کے ساتھ علمی مسائل بیان کرتا ٹھوس دلیلیں، فلسفیانہ نکتے، پائدار حقائق، دلنشین انداز بیان اور پھر لطف یہ کہ ابتدا سے انتہا تک تسلسل قائم رہتا۔ عوام کے جمگھٹے میں وہ دلچسپ مگر نصیحت آمیز لطیفے بیان کرتا، شعر پڑھتا۔ کہانیاں سُناتا۔ یہی لوگ ہنس رہے ہیں اور ابھی رو رہے ہیں۔ وہ تقریروں میں خواص کے دماغ اور عوام کے جذبات سے اپیل کرتا۔ وہ اُن شعلہ بیان مقرروں میں ہی تھا جو اپنی تقریروں کے اثر سے حکومتوں کے خلاف عوام کو بغاوت کے لئے اُبھار سکتے ہیں اور جن کے لیکچر سُن کر اسقدر بے باکی اور جرأت پیدا ہو جاتی ہے کہ پھانسی کا پھندا، طوق قمری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ بس یوں سمجھئے کہ موت کا ڈر دل سے نکل جاتا ہے اور سرفروشی اور جاں نثاری کے لئے جذبات ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

طاسو کو فلسفۂ الٰہیات سے غیر معمولی دلچسپی تھی وہ اکثر و بیشتر اسی موضوع پر بولتا اور اسکے ساتھ اخلاق کی اہمیت کی طرف اشارے کرتا۔ ایک دن وہ بہت بڑی مجمع میں تقریر کر رہا تھا۔ تمام سامعین بے خود تھے جیسے کسی نے تیز سی دارو پلا کر انہیں بیہوش

کر دیا ہے ۔ طاسو نے کہا ۔

"بُرے اخلاق اور ناشائستہ اعمال روح کو تاریک بناتے ہیں ...."

اس پر ایک بوڑھا آدمی اپنی ٹوپی ہاتھ میں لے کر کھڑا ہو گیا ۔

"تم کچھ دریافت کرنا چاہتے ہو" ـــــ طاسو نے بوڑھے سے پوچھا ۔

"جی ہاں قبلہ! اگر آپ کو زحمت نہ ہو" ـــــ بوڑھے نے جواب دیا ۔

"میں تو چاہتا ہوں کہ علمی مسائل پر گفت گو ہو ۔ نئے نئے نکتے ذہن میں آئیں اور یہ سلسلہ جاری رہے یہاں تک کہ حق ظاہر ہو جائے اور حقیقت کے چہرے سے ہر نقاب اُٹھ جائے" ـــــ طاسو بولا ۔

"میں روح کے بارے میں کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں" ـــــ بوڑھے نے کہا ۔

"رُوح جسم کی جان ، اعضاء و جوارح کا جوہر اور احساس و اثر کا مرکز ہے" ـــــ طاسو نے سوچتے ہوئے جواب دیا ۔

"شکریہ! مگر یہ تو فرمائیے کہ آدمی کے مرتے ہی یہ جوہر کہاں چلا جاتا ہے ۔ کیا یہ جوہر بھی جسم کی طرح فانی اور حادث ہے؟" ـــــ بوڑھے نے پوچھا ۔

"نہیں روح تو ازلی اور ابدی ہے جسے فنا نہیں" ـــــ طاسو نے جواب دیا ۔

"خدا کی طرح غیر فانی اور ازلیت و ابدیت کی حامل؟" ـــــ بوڑھے نے پنجوں کے بل اُٹھتے ہوئے دریافت کیا ۔

"خدا اور رُوح ایک نہیں ہیں؟ یہ بہت ہی نازک اور دقیق بات ہے" طاسو نے کہا ۔

"اسی لئے تو آپ سے دریافت کیا جا رہا ہے کہ آپ کا ناخنِ فکر اس نازک

عقدے کی گرہ کشائی کر سکے گا؟" ——— بوڑھے کے سوال پر طاسو سوچ
میں پڑ گیا وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ اُس کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا
کبھی اُس کا چہرہ کسی نکتہ کے ذہن میں آنے سے چمک اُٹھتا اور اُلجھن کے پیدا ہوتے ہی
چہرے کی چمک دھندلی ہو جاتی۔ تمام لوگ اُس کی طرف غور و فکر کی نگاہوں سے دیکھ
رہے تھے۔

"تو میں بیٹھ جاؤں ———؟"

"نہیں تم کھڑے رہو! مجھے بیٹھ جانا اور شاید یہاں سے چلا جانا پڑے گا۔
——— طاسو نے جواب دیا اور پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ اب حاضرین انگڑائیاں
اور جماہیاں لینے لگے۔ طاسو کے لبِ خاموش پر اُن کی نگاہیں جمی ہوئی تھیں مگر یہ قفل ٹوٹتا
ہی نہ تھا۔ طاسو سوچتے سوچتے یکبارگی چونکا اور اپنے گردوپیش پر نگاہ ڈالی اُس نے
محسوس کیا کہ لوگ انتظار کرتے کرتے اُکتا گئے ہیں اور اُن کو زیادہ دیر تک انتظار میں
رکھنا مناسب نہیں۔ اُس نے دو تین بار جلد جلد سر سہلایا اور تخت کے اگلے حصّہ
پر پیر رکھ کر بولا! —

"میں آپ حضرات سے معذرت خواہ ہوں کہ میرے سکوت نے آپ کو
صبر و ضبط کی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ مگر میں ایسا کرنے پر مجبور تھا جس بات کو میں خود
نہیں سمجھتا اُسے دوسروں کے سامنے بیان کرنا فریب ہی نہیں بد دیانتی بھی ہے۔!
مجھے افسوس ہے کہ میں آج سے آپ کے سامعہ کی تواضع نہ کرسکونگا۔ میری تقریروں کا
سلسلہ آج سے بند ہو جائے گا۔ مجھے روح کے مسئلہ پر غور کرنا ہے اور جب تک
میں اُسے سمجھ نہ لوں گا عام مجمعوں میں بولنے سے باز رہوں گا۔ یہ میرا ناقابل تبدیل

فیصلہ ہے جس میں استثناء کی گنجائش نہیں ہے۔ اب میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔"
لوگوں نے بوڑھوں کو برا بھلا کہا کہ تمہارے اغراض کے سبب ہم طاسو کی سحر بیانی اور
خوش کلامی سے محروم ہو گئے اور نہ جانے ہماری محرومی کا سلسلہ کب تک جاری رہیگا۔
تمہیں اعتراض کرنا تھا تو اس کے گھر جا کر اعتراض کرتے عام جلسے میں ٹوکنے اور رد و
قدح کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ طاسو اپنے ارادے میں چٹان کی طرح مضبوط ہے
چین کے تمام باشندے بھی مل کر اصرار کریں تو طاسو اپنے فیصلہ کو تبدیل نہیں کر سکتا۔
بوڑھا جواب دے سکتا تھا مگر غضبناک مجمع کسی کی معقول دلیل سنتا کب ہے؟
وہ بے چارہ خاموش ہو گیا اتنے بہت سے خشمناک تیوروں کو وہ کس طرح ملائم بناتا۔

طاسو نے روح کی حقیقت دریافت کرنے کے لئے قدیم تختیوں، کتبوں،
اور تصویروں کا مطالعہ شروع کر دیا ایک ایک نقش۔ ایک ایک حرف اور ایک ایک
اشارے کو پڑھا۔ بار بار پڑھا اور خوب غور سے پڑھا مگر مسئلہ کچھ اتنا پیچیدہ تھا کہ ہر
کوشش کے بعد گتھی سلجھنے کے بجائے اور الجھ جاتی۔ ایک بات واضح ہوتی تو دوسری
شق اس وضاحت کو اور مبہم اور ناقابلِ حل بنا دیتی۔ دریافت کرتے کرتے طاسو
کو جنون سا ہو گیا۔ روح کی تحقیق کا سودا اس کے سر میں اس بری طرح سمایا تھا کہ گھریلو
باتوں میں بھی وہ روح کا ذکر ضرور نکالتا۔ وہ جو کسی بھوکے سے کسی نے پوچھا تھا کہ دو
اور دو (۲+۲) کتنے ہوتے ہیں؟ اور بھوکے نے جواب دیا کہ چار روٹیاں۔ تو طاسو
کا بھی یہی حال تھا۔ تحقیق و جستجو کی بھوک کھانے کی بھوک سے زیادہ بے چین
کرتی ہے ایک دفعہ عدالت میں جب اس سے اس کا پیشہ دریافت کیا گیا تو
اس کے منہ سے بے ساختہ "روح" نکل گیا۔

فکر و نظر کا مطالعہ ناکام ثابت ہوا، اس قدر پڑھنے اور غور و فکر کرنے کے بعد اُس کا دماغ :-

معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

بے ساختہ پکار اُٹھا۔ اب اُسے کسی رہنما اور عارفِ باخبر کی تلاش تھی۔ سلوک و عرفان اور خبر و آگہی کی منزلیں رہبر کے بغیر طے نہیں ہوتیں۔ بہت کچھ دریافت اور تلاش کے بعد اُسے معلوم ہوا کہ چین کے مشرقی پہاڑوں کے غار میں ایک خدا رسیدہ فقیر رہتا ہے جو دنیا کو لات مار کر اور عیش و آرام تج کر نصف صدی سے مراقب اور مستغرق ہے۔ طاسو کو بتایا گیا کہ چین کے مشہور بادشاہ ووطنگ نے جس سلسلہ کوہ کے وسط میں قلعہ بنانے کی کوشش کی تھی اور نامکمل قلعہ کے مٹے مٹائے آثار اب تک باقی ہیں۔ وہ عارف کامل اُسی کے قریب رہتا ہے۔ وہاں پہنچنے کا راستہ بہت خطرناک ہے۔ شیروں کے کچھار، اژدہوں کے جنگل اور وحشی درندوں کے مسکن جگہ جگہ آتے ہیں۔ بہت سی جگہ پانی کے تیز چشموں نے راہ کو ناقابل گزر بنا دیا ہے۔ اُس جگہ وہی آدمی پہنچ سکتا ہے جو اپنے سر سے کفن باندھ کر بچوں سے یہ کہتا ہوا رختِ سفر باندھے کہ :-

"تم آج سے اپنے کو یتیم سمجھنا"

اور بیوی سے کہے کہ :-

"تمہارا سہاگ آج ختم ہوتا ہے"

طاسو کے لئے اس اطلاع کے بعد ایک اور مشکل کا سامنا اور ایک مسئلہ کا حل باقی تھا۔ گھر والوں کو اپنے سفر کی اطلاع دوں یا نہ دوں" یہ مسئلہ کئی دن

تک اُس کے غور و فکر کا مرکز بنا رہا۔ اپنے عزیزوں کی طبیعتوں اور مزاجوں سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ وہ لوگ اُسے کبھی اس خطرناک مہم پر نہ جانے دیتے، ایک ایک شخص اصرار کرتا۔ دلیلیں پیش کی جاتیں۔ عواقب و نتائج سے مطلع کیا جاتا۔ بیوی دامن پکڑتی اور بچے پیروں پر گر کر کہتے کہ جا رہے ہو تو ہمیں بھی زہر دیئے جاؤ۔ ہم تمہارے بغیر جی کر کیا کریں گے! آخر طاسو نے یہی فیصلہ کیا کہ خاندان والوں کو مطلع کئے بغیر ہی جانا مناسب ہے اور طلب علم اور انکشاف حقیقت کے لئے بے خبری کی روش غیر مستحسن نہیں ہے۔ میں اپنی جان کو خطرے میں ڈال رہا ہوں اور کسی دوسرے کو پھانس کی تکلیف بھی نہیں دے رہا ہوں۔ یہ خطر آزمائش کے بغیر زندگی سادہ و بے رنگ سی رہتی ہے۔ دُنیا کے کامیاب انسانوں نے خطرات کی پرواہ نہیں کی وہ خطرات سے کھیلے ہیں اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کی ہیں۔

طاسو عزمِ محکم کے بل پر گھر سے چل دیا۔ ایک مہینہ تک گھوڑے کی پیٹھ تھی اور وہ تھا۔ شاعر نے رہروِ محبت کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے کہ :-

رہروِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

اور طاسو کو تو قدم قدم پر مقاماتِ سخت و دشوار کا سامنا کرنا پڑا۔ نشیب و فراز، پگڈنڈیوں کے پیچ و خم، راستوں کے موڑ، کوہساروں کی بھیانک صدائے بازگشت، جنگل کا خوفناک سناٹا، درندوں کی ڈراؤنی آوازیں اور ان سب مصیبتوں پر قیامت تنہائی ——— طاسو سچ مچ موت کی وادی سے گزر رہا تھا۔ طاسو

کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار کر واپس ہو جاتا مگر ذوقِ طلب اور شوقِ تحقیق نے طاسو میں غیر معمولی جرأت اور مافوق الفطرت حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ روح کی ماہیت معلوم کرنے کا شوق اُسے کشاں کشاں لئے جا رہا تھا۔ وہ طوفانِ تُند و تیز کی طرح پست و بلند سے گزر رہا تھا۔ راستہ میں بستیاں ملتیں تو وہاں کے رہنے والوں سے وہ راستہ پوچھ لیتا۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ غلط سمت میں کوسوں دُور چلا گیا اور اُسے پھر منزل کی طرف واپس آنا پڑا۔ اس خطرناک مگر علمی مہم کے بہت سے دن رات اُس نے جنگل کے پھل کھا کر اور چشموں کا پانی پی کر بسر کئے۔

نیا دانہ، نیا پانی، مختلف مناظر، بدلتا ہوا ماحول، عجیب تجربے، دلچسپ مشاہدے، ـــــ طاسو نئی دُنیاؤں سے گزر رہا تھا۔ ایک گاؤں میں اُس نے دیکھا کہ لوگ جنازہ سر پہ اٹھائے ہوئے ہیں اور پُر زور قہقہے لگا رہے ہیں۔ ہر شخص مسرور، شادماں اور خندہ زن ہے۔ طاسو نے لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ تمام دُنیا کے لوگ موت پر غم کرتے ہیں اور یہاں معاملہ برعکس ہے؟ ایک بوڑھے دیہاتی نے جواب دیا کہ ہمارے یہاں کسی کے مرجانے پر غم کرنا اور آنسو بہانا انتہائی بزدلی کی نشانی ہے۔ کئی سو سال تک کی روایات تو ہمارے یہاں محفوظ ہیں۔ اس مدت میں بس ایک عورت اپنے جوان بیٹے کی موت پر روئی تھی سو اُس کا خاندان آج تک اس نواح میں بدنام ہے اور اُس گھرانے کے لوگ ذلیل سمجھے جاتے ہیں۔ آسمانی دیوتا مسکراہٹ، ہنسی اور قہقہوں سے خوش ہوتے ہیں۔ غم اُن کی ناراضی کا باعث ہوتا ہے۔

دُنیا میں جو یہ پریشانیاں نظر آتی ہیں اُس کا سبب یہی ہے کہ لوگوں نے رود دھو کر دیوتاؤں کو ناراض کر دیا ہے۔ اور آسمانی رحمتیں بہت کم نازل ہوتی ہیں۔

ایک گاؤں کے کسی مکان میں آگ لگی تھی اور لوگ دور کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ طاسو نے اُن سے کہا کہ تم لوگ آگ بجھانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ اس پر جواب دیا گیا کہ یہ آگ خود نہیں لگی بلکہ لگائی گئی ہے۔ ہمارے یہاں اِس مذہبی مکان کی راکھ پر کھیت بویا جاتا ہے اور اُس کی پیداوار سے کھانا پکا کر سب سے بڑی دیوی کے مجسمہ پر چڑھایا جاتا ہے۔ دیوی کی مہربانی سے اس علاقہ کی زمین سونا اُگلتی ہے۔ قدم قدم پر تالاب اور چشمے ہیں اور بارش بھی خوب ہوتی ہے۔ قرب وجوار کے لوگ ہمارے علاقہ کو زمین کی جنت کہتے ہیں۔ آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ چپہ بھر زمین بھی ہریالی سے خالی نہیں ہے۔

طاسو کئی دن تک جنگل میں سفر کرنے کے بعد ایک آبادی میں پہنچا۔ وہاں اُس نے دیکھا کہ ایک گلی میں بہت سی عورتیں گاتی ناچتی جا رہی ہیں اور اُن کے جھرمٹ میں ایک دُلہن ہے۔ عورتیں خوبصورت تو زیادہ نہ تھیں مگر اُن کے جسموں کی بناوٹ میں غضب کا تناسب پایا جاتا تھا۔ ایک ایک جوڑ سانچے میں ڈھلا ہوا۔ تنگ لباس نے تناسب میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ طاسو تھوڑے پر وار اُن کے قریب پہنچا ہی تھا کہ عورتوں نے شور مچا کر اُس کی طرف پتھر پھینکنے شروع کیے۔ اتنے میں بہت سے مرد اکٹھا ہو گئے۔ اور طاسو گرفتار ہو گیا۔ طاسو کو بتایا گیا کہ اس علاقہ میں لڑکی والے لڑکے والوں کے یہاں برات لے کر جاتے ہیں اور دُلہن دولہا کو بیاہ کر لاتی ہے۔ بارات میں کوئی مرد شامل نہیں ہو سکتا۔ بستی کے مرد اُس دن گھروں میں بیٹھ

جاتے ہیں کہ کہیں کسی گلی یا موڑ پہ بارات کا سامنا نہ ہو جائے۔ طاسو نے کہا میں تو پردیسی ہوں۔ مجھے تمہارے یہاں کے رسم و رواج کی خبر نہ تھی! میں کسی بُری نیت سے برات کے قریب نہیں آیا۔ لوگوں نے کہا اس کا فیصلہ تو بستی کے حاکم کرینگے۔ آپ اُن کے سامنے جا کر صفائی پیش کر سکتے ہیں —— طاسو کو لوگ حاکم قریہ کے یہاں لے گئے اور حاکم کو دیکھتے ہی سب نے زبانیں منہ سے باہر نکال لیں۔ یہ اُن کا سلام تھا۔ حاکم نے زبان ہونٹوں پر پھیر کر اُن سب کا سلام قبول کیا۔ طاسو نے بھی اُن کی دیکھا دیکھی زبان باہر نکال دی۔ طاسو ملزم اور حاکم میں بات چیت ہونے لگی۔

"انصاف کے دیوتا کی قسم کھاؤ کہ قریب قریب سچ بیان کروں گا۔"

"میں دیوتا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بالکل سچ کہوں گا۔"

"عدالت کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔ اس کی سزا بہت سخت ہے۔"

"میں نے تو کوئی اس قسم کی بات نہیں کی۔"

"دُنیا میں کوئی آدمی مکمل سچ نہیں بول سکتا۔ ہاں قریب قریب سچ کہہ سکتا ہے۔"

"تو میں جھوٹی بات ہرگز نہ کہوں گا۔"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ واقعات کی تفصیل میں ہزار احتیاط کے باوجود رنگ آمیزی سے کام لینا ہی پڑتا ہے۔ اور یہی جھوٹ ہے۔"

اس کے بعد حاکم نے چند ضروری سوالات کئے اور عدالت نے جوابات سُننے کے بعد یہ سزا تجویز کی کہ ملزم آٹھ گھڑیوں کے لئے دس دن تک تالاب

سے پانی لائے گا۔ عدالت کے سپاہی میعادِ سزا کے اختتام تک ملزم پر
نگرانی رکھیں گے۔ دس دن تک طآسو کو پانی بھرنا پڑا۔ عورتوں سے وہ اس
قدر ڈر گیا تھا کہ گاؤں میں کوئی عورت نظر آتی تو طآسو اُس کے سایہ سے بھی
بچ کر چلتا۔ سزا کی میعاد ختم ہوتے ہی وہ چل پڑا۔ سزا کے زمانہ میں اُس کے گھوڑے
کو سستانے کا موقع مل گیا اور اب وہ تازہ دم ہو کر شوخیاں کرنے لگا۔

راستے میں اُسے اس قدر خوف ناک جنگل بھی ملے جہاں شیر، بھیڑ
بکری کی طرح گھوم رہے تھے۔ مگر طآسو کا دماغ شیروں کی دہاڑیں سُن کر
بھی فلسفۂ رُوح پر غور کرنے سے باز نہ رہا۔ ایک دن شام کو وہ گھوڑے
پر دامنِ کوہ میں ایک بہتے ہوئے چشمے کے قریب سے گزر رہا تھا۔ زمین
پتھریلی اور اونچی نیچی تھی اتنی تیز ہوا چل رہی تھی کہ تناور درخت ڈگمگائے جاتے
تھے۔ آگے چل کر راستہ اور دشوار گزار ہو گیا۔ رات کی تاریکی نے اس
دشواری میں اضافہ کر دیا۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کا عالم تھا گھوڑا
بار بار سمٹتا اور اُس کا بند بند کانپنے لگتا۔ ہوا کی مہیب سائیں سائیں۔ چشمے
کا خوف ناک شور، درندوں کی آوازیں۔ خطرناک اندھیرا۔ ناقابلِ عبور
راستہ! طآسو بہ ہر حال انسان تھا۔ آج کے منظر نے اُس کو بھی ہراساں
کر دیا اُسے اندیشہ ہو چلا تھا کہ آج کوئی نہ کوئی مصیبت آ کر رہے گی۔
انتہائی ضبط و جرأت کے باوجود اُس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ طآسو نے
اپنا یہ عالم دیکھ کر دل ہی دل میں اپنے کو ملامت کی کہ منزل کے قریب پہنچ کر
بُزدلی دکھاتے ہو۔ بہت سے بہت یہ ہو گا کہ تم مر جاؤ گے۔ مگر مرنا بھی حال ایک

دن ہوگا۔ موت سے تو مفر ممکن نہیں۔ جب موت آنی ٹھہری تو وہ چاہے نرم بستر پر آئے یا پہاڑ کے غاروں میں! اور تم تو ایک بلند اور پاکیزہ مقصد کے راستے میں جان دے رہے ہو۔ اس تصور نے اُس کے دل کو کچھ مضبوط کیا ہی تھا کہ گھوڑے کا پیر چٹان سے پھسلا اور طاسو کو لے کر وہ غار میں گر گیا۔ گھوڑے کا سر پتھروں سے ٹکرایا اور وہ دو چار بار ٹانگیں رگڑ کر ختم ہو گیا۔ طاسو بھی سر کے بل گرا مگر اُس کا سر گرتے وقت گھوڑے کے پیٹ سے جا کر لگا۔ سر میں دھمک آئی اور بہت زور کی دھمک آئی۔ پتھروں نے اُس کے جسم کو لہولہان کر دیا۔ پوری رات اسی عالم بے خودی میں گزری۔ موت نہ ہو تو تلوار کی دھار بھی حلقوم پر چل کر کند ہو جاتی ہے اور جب وقت آ جائے تو پھول سونگھتے دم نکل جاتا ہے۔ موت خود زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔ موت کے آنے سے پہلے کوئی چیز زندگی کو ختم نہیں کر سکتی۔ حادثہ شدید اور انتہائی شدید تھا۔ سیکڑوں فٹ کی بلندی سے پتھریلے غار میں گر کر بچ جانا زندگی کا ایک معجزہ اور قدرتِ خدا کی ایک نشانی تھی۔ ایک مجروح اور بے ہوش انسان بہت آسانی سے درندوں کا لقمہ بن سکتا تھا۔ مگر درندے اُس رات غار کی طرف نہیں آئے۔ رات کا سناٹا طاسو کے بے ہوش جسم کا پہرہ دیتا رہا۔ یہاں تک کہ سپیدۂ سحر نمودار ہوا اور ایک پہاڑی جو اپنی گم شدہ بھیڑ کی تلاش میں اِدھر آنکلا تھا طاسو کو اُٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ پہاڑی کے گھر والوں نے اس کی مرہم پٹی کی اور دوسرے دن جا کر اُسے ہوش آیا۔

"میں کہاں ہوں ؟" —— طاسو نے کراہتے ہوئے پوچھا۔
"تم ایک غریب پہاڑی کے گھر میں ہو" —— پہاڑی نے جواب دیا۔
"اور میرا گھوڑا ؟" —— طاسو نے دریافت کیا۔
"وہ مر گیا اور خدا نے آپ کو بچالیا !" —— پہاڑی نے کہا۔
"مجھے رُوح کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے بہت جلد جانا چاہیئے میں کب تک جانے کے قابل ہو سکوں گا ؟" —— طاسو بولا۔ اور اس پر اُس کے تیمار دار ایک دوسرے کو اشارہ کرنے لگے کہ مریض کو بحران ہو گیا ہے اس لئے وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔

پہاڑی آدمی اور اُس کے گھر والوں نے طاسو کی بڑی دل سوزی اور ہمدردی کے ساتھ تیمارداری کی۔ پہاڑی کی بوڑھی ماں طاسو کا دل بہلانے کے لئے پہروں قصّے کہانیاں سُناتی۔ یہ کہانیاں مذہبی تھیں جو سیکڑوں سال سے سینہ بہ سینہ چلی آرہی تھیں۔ اِن قصّوں کو سُنکر طاسو دل ہی دل میں مُسکراتا —— کہانیوں کے چند اقتباسات :-

"سورج لڑائی کے دیوتا کا روٹی پکانے کا توا ہے۔ وہ دیوتا سال بھر میں ایک دن کھانا کھاتا ہے مگر کتنا ؟ سارے دُنیا کے آدمیوں کی خوراک سے زیادہ ! مگر تم (طاسو سے مخاطب ہو کر) مجھ سے یہ تو پوچھو کہ ایک وقت اتنے بہت سے کھانے کا انتظام کون کرتا ہے ؟ تو یہ بھی سُن لو ! ہر کھیت اور ہر باغ میں لڑائی کے دیوتا کا حصّہ ہوتا ہے۔ اُس کا حصّہ آسمانوں میں جمع ہوتا رہتا ہے —— جانتے ہو اوس کیا ہے ؟ سُنو ! حُسن کی دیوی

کا جسم چاندی سے زیادہ سفید اور اُجلا ہے مگر ساتھ ہی اُس کے سیدھے رُخسار پر ایک داغ بھی ہے! اس کے رُخسار پر نشان کس طرح ہوا؟ یہ ماجرا ابھی سنائے دیتی ہوں! حُسن کی دیوی نے خدا کی بارگاہ میں عرض کی کہ جنّت اور دوزخ کی سیر کرنا چاہتی ہوں خدا نے دیوی کا کہا مان لیا اور اُسے اجازت مل گئی۔ خدا نے کہا کہ اہلِ جنّت کی حالت پر نہ خوش ہونا اور نہ دوزخیوں کو عذاب میں دیکھ کر غم کرنا ورنہ تمہیں نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ دیوی جب جنّت کی سیر کر کے دوزخ میں آئی تو اُس نے دیکھا کہ بہت سے آدمیوں کو دہکتی ہوئی آگ میں ڈالا جا رہا ہے۔ بس یہ منظر دیکھ کر اُس کے منھ سے چیخ نکل گئی اور فوراً ہی ایک شعلہ اُس کی طرف لپکا اور بھاگتے بھاگتے اُس کے رُخسار کو جلا دیا۔ حُسن کی دیوی صُبح شام اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھ کر پہلے تو خوش ہوتی ہے۔ کہ مجھے دُنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت بنایا گیا ہے مگر چہرے کے داغ پر نگاہ پڑتے ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ اور اُن ہی آنسوؤں کو دُنیا والے شبنم کہتے ہیں " ——— بڑھیا کی باتیں بہت دلچسپ ہوتیں۔ طاسو کسی قسم کا اظہارِ خیال کئے بغیر بڑھیا کی باتوں سے لُطف لیتا اور دِل دہی کے لئے اُس کی تعریفیں کرتا۔

اس حادثہ نے طاسو کے ارادے میں اور استحکام پیدا کر دیا۔ وہ کہتا کہ اس قدر بلندی سے غار میں گر کر زندہ رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ قدرت مجھے ضائع کرنا نہیں چاہتی اور حقیقتِ رُوح کا انکشاف مجھے ہو کر رہے گا۔ حصولِ مقصد کے لئے خطروں سے گزرنا ضروری اور ناگزیر ہے جو

شخص خطروں میں پڑ کر یا اُن سے گزر کر ہمت ہار بیٹھا اُس نے گویا ساحل کے قریب پہنچکر سفینہ کو خود ہی ڈبو دیا۔ اور جب عزم میں استقلال اور عزم میں بلندی ہو تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ کوشش پیہم پتھر کو پانی کر دیتی ہے اور گہرے دریا پایاب ہو جاتے ہیں۔

طاسو کے زخم بھر چکے تھے۔ وہ آسانی کے ساتھ چل پھر سکتا تھا۔ پوری طاقت آنے کے لئے چند دن آرام کی ضرورت تھی۔ یہ دن بھی گزر گئے اور وہ پہلے کی طرح بھلا چنگا ہو گیا۔ اب اُسے کوئی طاقت نہ روک سکتی تھی۔ وہ سفر کی تیاری کرنے لگا۔ غار میں گر کر پانی کی چھاگل، کمان اور ترکش نا قابل استعمال ہو گئے تھے۔ اُس کے مہربان میزبان نے تمام ضروری چیزیں مہیا کر دیں۔ طاسو کو اپنی ضائع شدہ چیزوں میں صرف ایک چیز کا غم تھا اور وہ چیز ایک لوح مصوّر تھی جس میں تصویروں کے ذریعہ اقوالِ حکمت ظاہر کئے گئے تھے۔ یہ تختی ایک مقدّس یادگار تھی جو طاسو کے گھرانے میں پشتہا پشت سے چلی آ رہی تھی۔ اس لوح کے بارے میں عجیب عجیب روایتیں بیان کی جاتی تھیں۔ کوئی کہتا کہ آسمانی دیوتاؤں نے مل جل کر اس تختی کو مرتّب کیا۔ اور وہ اسے خدا کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لئے لے جا رہے تھے کہ ایک دیوتا کا آسمان سے پیر پھسل گیا اور زمین پر گر گیا۔ یہ تختی بھی اُسی کے ساتھ تھی جو زمین پر رہ گئی۔

کسی کا بیان تھا کہ جس دیوتا نے زمینوں اور آسمانوں کو بنایا تھا اُس کے ساتھ یہ لوحِ مقدّس تھی اس تختی میں آسمان و زمین کی تعمیر اور ترتیب

کے لئے اشارے درج تھے۔ دیوتا نے اسی لوح کو دیکھ کر چاند، ستارے، کہکشاں، دریا، سمندر، پہاڑ بنائے۔ طاسو کو ان کہانیوں سے زیادہ اُس تختی کے اقوالِ حکمت سے دلچسپی تھی۔ اُس نے پہاڑی سے کہا کہ غار میں میری تختی رہ گئی ہے میں اُسے تلاش کرنے کے لئے جانا چاہتا ہوں۔ پہاڑی نے جواب دیا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ وہاں آپ کا تنہا جانا ٹھیک نہیں۔ وہ دونوں غار میں پہنچے۔ تختی کے ٹکڑے پتھروں اور سنگریزوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور کچھ پرند جن کی چونچوں میں تختی کے ٹکڑے تھے آس پاس مرے پڑے تھے۔ طاسو نے زمین پر منتشر لوح پاروں کو جمع کیا اور پرندوں کی چونچوں سے ٹکڑوں کو نکالا، تختی کے ٹکڑے جیسے ہی پرندوں کی چونچوں سے جُدا ہوئے وہ پھڑپھڑا کر اُڑ گئے۔ طاسو اور پہاڑی ایک دوسرے کو نگاہِ حیرت سے دیکھنے لگے۔ طاسو تختی کے ٹکڑے لیکر اپنے میزبان کے یہاں آ گیا۔

پہاڑی کی جوان لڑکی طاسو سے بڑی ہمدردی کے ساتھ پیش آتی تھی۔ ہر وقت تنہائی اور خلوت میسّر تھی مگر طاسو نے ضمیر بیدار، دل صاف اور نگاہِ پاک پائی تھی۔ اُس نے لڑکی کی مُسکراہٹ سے بھی حظ اُٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ لڑکی شوخ اور چنچل تھی اور شوخ جوانی بہت آسانی سے بے راہ رو ہو سکتی تھی۔ طاسو سے لڑکی گیت سُنانے کی فرمائش کرتی۔ طاسو کہتا مجھے گیت یاد نہیں ہیں۔ وہ اُسے مذہبی کہانیاں سُناتا، نصیحت کی باتیں کرتا۔ اُس نے ایک گیت بھی لڑکی کو نہ سُنایا۔ گیت اُسے یاد تھے۔ وہ خوش گلو بھی تھا مگر وہ جانتا تھا کہ شعر و نغمہ کی پہلی زد جذبات پر پڑتی ہے اور جوان جذبات کو چھیڑنا

خطرناک اقدام ہے۔

ایک دن طاسو کے میزبان کے یہاں کچھ مہمان آئے۔ اُن مہمانوں میں ایک نوجوان بھی تھا۔ اُس کے تیوروں سے بے باکی۔ آزادروی اور بے اعتدالی ٹپکتی تھی۔ لڑکی سے وہ خوب گھُل مل کر باتیں کرتا۔ رنگین گیت سُناتا اور موقع پا کر چھیڑ چھاڑ سے بھی باز نہ آتا۔ طاسو نوجوان کی نقل و حرکت کا نگاہ غور سے مطالعہ کر رہا تھا اُس نے محسوس کیا کہ لڑکی بھی نوجوان سے مانوس ہے۔ اُس کی آنکھوں میں شدتِ عتاب سے چنگاریاں رقص کرنے لگیں۔ پہاڑی کا ننگ و ناموس طاسو کی غیرت و شرافت سے اپیل کر رہا تھا کہ خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔

طاسو نے رات کو سوتے میں نوجوان کے منہ میں لوحِ مقدس کا ایک ریزہ رکھ دیا اور ریزہ کے نگلتے ہی نوجوان کے دل کی حرکت بند ہو گئی اور آن کی آن میں اُس کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ نوجوان پڑا سو رہا ہے۔ گھر والوں نے اُس کے دیر تک سوتے رہنے کو جوانی کی نیند سمجھا۔ جب دن خوب پھیل گیا۔ تو پہاڑی نے نوجوان کے جسم کو جھنجوڑ کر کہا کہ گھوڑے بیچ کر سوئے ہو کیا؟ جو اُٹھنے کا نام نہیں لیتے! جسم ٹھنڈا اور بے حرکت تھا۔ ایں یہ کیا ہوا؟ ۔ پہاڑی نے یہ کہتے ہوئے گھر والوں کو بُلایا۔ سب لوگ اکٹھا ہو گئے اور نوجوان کو مُردہ پا کر افسوس کرنے لگے۔ اس تاسف میں حیرت بھی شامل تھی۔ پہاڑی کی لڑکی کے آنسو پلکوں پر جم کر رہ گئے۔ شاید وہ اپنا غم چھپانا چاہتی تھی۔ طاسو دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ

لوحِ مقدس کے ایک ریزے نے ہوسناکی کے اس ڈرامہ کو ختم کردیا۔
چند دن کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہوگیا اور کئی ماہ مسلسل سفر کرتا رہا۔ اُس کا رفیقِ راہ گھوڑا داغِ مفارقت دے چکا تھا۔ اب اُسے پاپیادہ چلنا پڑا۔ اُس کے سفر کا یہ عالم تھا:۔ ؎

راہوں کے بعد منزل۔ منزل کے بعد راہیں

آخر اُسے منزلِ مقصود کے آثار نظر آنے لگے۔ اُس کا شوق سوادِ منزل کو دیکھ کر اور تیز گام ہوگیا۔ کوہسار کے دامن میں قلعہ کی ادھوری عمارت کے بچے کھچے آثار پائے جاتے تھے۔ برگد کے پرانے اور بوڑھے درختوں نے اس ماحول کو تاریک بنا دیا تھا۔ گھنا سایہ اندھیرا بن جاتا ہے۔ قلعہ کے نیچے آبشار جاری تھا۔ پہاڑی پرندے پانی سے کھیل رہے تھے۔ طاسو نے قلعہ کی فصیل پر چڑھ کر نظر ڈالی۔ درختوں کے آخری حصّہ کے قریب ایک غار دکھائی دیا۔ جس کے چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا یہاں تک کہ پتھریلی زمین اور چٹانیں بھی سبزہ پوش تھیں۔ طاسو مسکرانے لگا۔ منزلِ مقصود نگاہوں کے سامنے تھی۔ وہ ڈھلوان اور کھردری چٹانوں سے آہستگی کے ساتھ اُترا۔ غار تک پہنچنے کے کئی راستے تھے۔ کشادہ، تنگ اور دشوار گزار! طاسو کی مشکل پسند طبیعت نے دشوار راستہ اختیار کیا۔ وہ تجربہ کر چکا تھا کہ دشواریوں ہی سے فتحِ باب ہوتا ہے اور مشکلوں ہی سے آسانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ پھر منزل پر پہنچکر تو اور زیادہ جوشش اور مستعدی دکھانی چاہئیے۔ منزلِ مقصود پُرجوش مسافر اور تیز گام رہرو کی تلاش میں رہتی ہے۔ آسودگانِ منزل سے

منزل کا ایک ایک ذرّہ پناہ مانگتا ہے۔ وہاں تو ایسا قیامت آفریں رہرو چاہیئے
کہ جس کی گرمیِ رفتار سے ؎

نبضِ جادہ تپد و سینۂ صحرا گرم است

کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ راستہ گھنی جھاڑیوں سے ڈھکا تھا۔ کسی آنے
جانے کا نقش قدم بھی نظر نہ آتا تھا۔ جھاڑیوں کا ایک دوسرے کی شاخوں سے
آغوش در آغوش ہو جانا اس بات کا پتہ دے رہا تھا کہ مدّتِ دراز سے کوئی
مسافر ادھر سے ہو کر نہیں گزرا۔ طاسو جھاڑیاں چیر چیر کر آگے بڑھا اور تھوڑی
دیر میں غار کے دہانے پر .... پہنچ گیا۔ اُس کے ماتھے سے پسینہ
ٹپک رہا تھا۔ طاسو کے پسینہ کی بوندیں اوس کے قطروں میں مل کر ہم رنگِ صحرا
ہو گئیں۔

غار کے دروازے پر درندوں کے پیر کے نشان، شیروں کے ناخن
اور بال، جانوروں کی ہڈیاں اور پرندوں کے پر بکھرے ہوئے تھے۔ پیروں کے
نشانوں کی بے ترتیبی اور اوھ کٹ نقوشِ قدم سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
اس مقام پر درندوں کی جنگ ہوئی ہے۔ چٹانوں پر جگہ جگہ خون کے دُھندلے
نشان بھی نظر آتے تھے۔ طاسو بڑھا چلا گیا۔ آگے جا کر اُسے پہاڑوں کے
درمیان ایک ترشا ہوا سا دروازہ ملا۔ امتدادِ زمانہ کے سبب پہاڑ کے
پتھر جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے تھے اور چٹانوں کے درمیان یہ خلا دروازہ سا
بن گیا تھا۔ طاسو اندر پہنچا۔ غار کے بیچ میں ایک بوڑھا آدمی جس کے سر کے
بال تو بال بھویں بھی سپید ہو گئی تھیں۔ سُرخ پتھر پر آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔

بوڑھے فقیر کے آس پاس گھاس اُگ آئی تھی اور تمام ماحول پر قدامت کا اندھیرا چھایا تھا۔

"کون ہو تم؟" ——— بوڑھے فقیر نے طاسو کی آہٹ سُن کر کہا۔

"ایک جویائے حقیقت!" ——— طاسو نے جواب دیا۔ اور بوڑھے نے مُسکرا کر آنکھیں کھول دیں۔ بوڑھے نے طاسو کی طرف آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ طاسو لمبی لمبی ڈگیں بھر کر فقیر کی طرف بڑھ رہا تھا کہ فقیر تیز لہجہ میں بولا:۔

"اس پتھر سے دُور کھڑے رہنا! اس سے تمہارا جسم چھو گیا تو جل کر خاک ہو جاؤ گے۔ میں نے ساٹھ سال تک اس پر ریاضت کی ہے۔ اس پتھر میں سچ مچ آگ بھری ہے۔ ذرا سے تصادم سے شعلے بھڑک اُٹھیں گے۔"

طاسو گھاس کے قریب ادب کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور فقیر نے تقریر شروع کر دی:۔

"تم نے اپنے کو جویائے حقیقت کہا ہے۔ یعنی تم حقیقت کی جستجو میں یہاں تک آئے ہو! کیا تم نے جستجو کی حقیقت معلوم کر لی؟"۔ (طاسو نے حیرت کے ساتھ "جستجو کی حقیقت" کہا) ہاں جستجو کی حقیقت! ہر چیز، ہر کام، ہر احساس اور ہر ارادہ ایک حقیقت رکھتا ہے۔ جو لوگ حقیقت افعال سے بے خبر ہو کر کام کرتے ہیں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے!

دُنیوی نقطۂ نگاہ سے تو اُنہیں کامیابی ہو جاتی ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ
ناکام رہتے ہیں۔" (میں روح کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں"
—— طاسو بُوڑھے فقیر کی آنکھوں پر نظریں جما کر بولا)

"روح کی حقیقت (فقیر قہقہہ لگاتا ہے) معلوم کرنا چاہتے ہو؟
غالباً تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ دُنیا میں بہت سی حقیقتیں ہیں؟ اگر تم اس
فریب میں مُبتلا ہو تو حقیقت کی پرچھائیں بھی تمہیں نظر نہیں آسکتی۔ کائنات
میں بس ایک حقیقتِ مشترک ہی کارفرما ہے اور یہ طلسمِ مجاز اسی حقیقت
کے سہارے قائم ہے۔ یہ حقیقت ناقابلِ تبدیل ہے! ازل سے ابد تک
حقیقت کا مزاج یکساں رہا ہے اور رہے گا —— مگر تم مایوس نہ ہو۔
میں تمہیں رُوح کا بھی تفصیلی مشاہدہ کرا دوں گا۔ مگر ایک شرط ہے کہ تمہیں صبر
و ضبط سے کام لینا ہوگا۔ اگر مشاہدے کے عالم میں تمہاری نفسی کیفیات اعتدال
پر نہ رہ سکیں تو ہم دونوں کے لئے شدید خطرہ ہے۔ راز کی باتیں ہر کسی
کو نہیں بتائی جاتیں۔ اور جسے بتائی جاتی ہیں تو اُسے ضبط و وقار کا پہاڑ
بن کر رہنا پڑتا ہے۔"

"میں آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں"——
—— طاسو نے خوش ہو کر کہا)۔

"دیکھو! خوب سوچ لو! اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم یہاں آکر واپس
جا سکتے ہو؟ تمہیں نہیں معلوم کہ اسرار و رموز کے کتنے آتش فشاں میں اپنے
سینے میں رکھتا ہوں۔ دیکھو! تم اُنہی شعلوں سے کھیل رہے ہو! اگر تم نے

ضبط واحتیاط سے کام نہ لیا تو رہبر اور رہرو دونوں پیوندِ خاک ہو جائیں گے۔
"میں موت سے نہیں ڈرتا مگر مجھے صرف اس کا غم ہے کہ کوہسار کا یہ ماحول جہاں میں نے زندگی کے پچاس سال گزارے ہیں مجھے نہ پاکر افسردہ ہو جائے گا۔ درخت چٹانیں، پرندے اور وحشی جانور تک مجھ سے مانوس ہیں۔ نہ میں کسی سے ڈرتا ہوں اور نہ وہ مجھ سے خوف کرتے ہیں۔ اسی چیز نے ہم میں اُنس پیدا کر دیا ہے۔ ہمارے تعلقات کی بنیاد خوف پر نہیں۔ خلوص پر ہے۔" (تو آپ خلوص کی حقیقت مجھے سمجھا رہے ہیں؟ —— طاسو نے کہا) ہر بات حقیقت نہیں ہوا کرتی بیٹے! حقیقت اتنی سستی اور عام نہیں ہے۔ تم ابھی سے بے صبر ہوئے جا رہے ہو! میں جو کچھ کہوں سنتے رہو۔ (اتنے میں جنگلی پرندے غار کے پتھروں پر آکر بیٹھ جاتے ہیں اور طاسو کو دیکھکر آوازیں کرتے ہیں) تم نے کچھ دیکھا؟ (جی ہاں! پرندوں کو دیکھا —— طاسو بولا)۔ یہ تمہیں دیکھ کر وحشت کا اظہار کر رہے ہیں! ہر نئی چیز کو دیکھ کر ہر جاندار ذرا متوحش سا ہو جاتا ہے۔ آدمی بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہ اُن کے نفس کی کمزوری اور شعور کی کوتاہی ہے۔ شعور جب تک ناقص ہے وحشت و خوف آدمی کے قلب و دماغ کو پراگندہ رکھتے ہیں۔ یہی پراگندگیِ حواس اور انتشارِ خیال ہے جو حقیقت کی پہچان سے آدمی کو دُور رکھتا ہے۔
اب میں اپنے وعدے کے مطابق حقیقت روح کا تمہیں مشاہدہ کراتا ہوں۔ اس کھُردری چٹان کے کنارے پر جاکر بیٹھ جاؤ (طاسو چٹان پر بیٹھتا ہے) یہاں جو گھاس کے تنکے اور جھاڑیوں کی شاخیں ہیں انہیں اُکھاڑ کر

پھینک دو۔ اس خس و خاشاک کو اُکھاڑتے وقت اپنے دل سے تمام وسوسوں کو نکالنے کی کوشش کرو یہاں تک کہ تمہارا دل اس چٹان کیطرح سادہ اور بے رنگ ہو جائے۔ میں بھی اپنی باطنی توجہ سے اس کام میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ (طاسو نے بہت تیزی کے ساتھ جھاڑیوں کو اُکھاڑ کر پھینک دیا۔) اب تم آنکھیں بند کر لو اور اپنی صورت کے خیالی تصوّر پر توجہ کو مرکوز کر دو۔ (طاسو نے آنکھیں بند کر لیں۔)

پیر عارف نے مراقبہ کیا اور ہمہ تن مستغرق ہو گیا۔ اُس کے ماتھے کی سلوٹیں ایک ایک کر کے اُبھر آئیں اور اُس کے چہرے پر جلال کے آثار پیدا ہو گئے۔ اُس نے دونوں ہاتھوں کی مُٹھیوں کو خوب زور سے دبایا۔ فقیر کی پہلی توجہ پر...... طاسو نے دیکھا کہ خوف ناک درندے اُس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ درندوں کے ساتھ وحشی لوگ جلتی مشعلوں کو لے کر طاسو کو غضبناک نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام ماحول پر دھواں سا چھا گیا۔ اب تاریکی کے سوا کوئی چیز نہ آتی تھی۔ مگر تاریکی بھی بے حد خوفناک تھی۔ لیکن طاسو نہایت ضبط کے ساتھ اس دہشت انگیز منظر کو دیکھتا رہا۔ فقیر کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی اس تصوّر کے ساتھ کہ طاسو خوف و دہشت کو اہمیت نہیں دیتا اور اُس کا نفس خارجی اثرات کو قبول نہیں کرتا۔

فقیر نے پھر توجہ ڈالی اور اب کی بار طوفان نظر آنے لگے۔ ایک ایک موج آسمان کو چھُو رہی تھی اور سُورج موجوں کی زد میں آ کر بے نور ہو گیا تھا۔ طوفان میں قیامت کی گھڑگھڑاہٹ تھی۔ موجوں کے ساتھ اژدہے اور

مگر مچھ دوڑ رہے تھے۔ طوفان نے طاؔسو کو گھیر لیا۔ مگر ان تمام خوف ناک مشاہدوں
کے بعد بھی طاؔسو نے حرکت نہیں کی وہ اپنی جگہ جما بیٹھا رہا۔

فقیر کی تیسری توجہ پر طاؔسو نے دیکھا کہ آسمان سے ایک دھواں سا
زمین کی جانب آیا اور وہ زمین پر آکر مجسم ہو گیا۔ دیوِ سیاہ کی طرح خوفناک
شکل نے قہقہہ لگایا اور اُس نے اپنی ٹھوکر سے زمین کے تمام پہاڑوں کو
چکنا چور بلکہ ریزہ ریزہ کر دیا۔ پھر اُس نے دریاؤں اور سمندروں کے پانی کو
ایک چُلّو میں بھر کر منھ میں اُنڈیل لیا۔ زمین کی تباہی جب ہو چکی تو اُس نے
سُورج کو مُٹھی میں دبا کر سُرمہ بنا دیا۔ سورج کے فنا ہوتے ہی نظامِ کواکب
میں ابتری پیدا ہو گئی۔ ستارے آپس میں ٹکرانے لگے اور ذرا سی دیر میں
آسمان دھوئیں کی طرح سیاہ ہو کر رہ گیا۔ طاؔسو اب بھی بے حس و
بے حرکت تھا۔

فقیر نے مُٹھیوں کو پھر زور سے دبایا۔ اور طاؔسو کی نگاہوں کے سامنے
ایک رنگین منظر آ گیا۔ باغ و بہار، سبزہ، پھولوں کے تختے۔ لالہ و گُل کی کیاریاں
انگوروں کے خوشے، گنگناتے آبشار اور رقص کرتی نہریں۔ وہ سچ مچ کلیوں
کی چٹک اپنے کانوں سے سُن رہا تھا۔ یہ جنّت نگاہ جاندار اور صاحبِ احساس
و شعور تھی۔ تتلی جب پھولوں کی پتّی کی طرف آتی تو پھول اپنی پتّیوں کو تتلی کی
سمت جُھکاتا کہ مجھے چوم کر آگے جانا! بلبل کو دیکھ کر گلاب کی شاخیں انگڑائیاں
سی لینے لگتیں۔ طاؔسو محسوس کر رہا تھا کہ اس رنگین ماحول کی ایک ایک پتّی جذبات
رکھتی ہے۔ اور یہاں کا ایک ایک تنکا احساس زدہ ہے۔ اتنے میں ساری

فضا رقص کرنے لگی۔ سرو و شمشاد اور مولسری کے درخت ایک دوسرے کے گرد گھوم رہے تھے۔ پھولوں کی اوٹ سے حسین و نوخیز عورتیں سورج کی طرح طلوع ہوئیں۔ انتہائی مہین لباس، سُرخ و سپید رنگت۔ متناسب اعضاء اور جوانی کا تو یہ عالم تھا کہ :-

؎ بندِ قبا بھی تنگ تھے زورِ شباب سے

عورتیں نہیں حُسن کے معجزے، خوبصورتی کا چلتا پھرتا جادو، دل کُشی کے شاہکار وہ جو کسی اہلِ نظر نے کہا ہے کہ حُسن جب چُپ چاپ کھڑا رہتا ہے تو تصویر کہلاتا ہے اور جب رقص و حرکت کرنے لگتا ہے تو شعر بن جاتا ہے۔ اس فردوس میں حُسن شعر کے لباس میں جلوہ گر تھا۔ نازنینوں میں چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ بیباکانہ چُہلیں، گُستاخانہ ہنسی مذاق ——— مُسکراہٹیں، قہقہے، مسرتیں اور وہ سب جو اظہارِ شادمانی کے لئے ضروری ہے۔ حُسن و دل کشی کے یہ رنگین مجسمے جب روشوں سے گزرتے تو پھولوں کی شاخیں اُن کی طرف جُھک جاتیں! یہاں تک کہ شاخِ صنوبر نے ایک نوخیز حسینہ کی طرف دستِ شوق بڑھایا اور عورت گدگدی محسوس کرکے مُسکرا دی ——— ماسو کی سانسیں تیز ہوگئیں، اُس کا دل دھڑکنے لگا اور اُس نے پہلو بدلا ہی تھا کہ غار میں پُر زور دھماکا ہوا۔ ماسو نے آنکھیں کھول دیں۔ چٹان سے شعلے نکل رہے تھے اور فقیر جل رہا تھا۔ شعلوں سے آواز آئی :-

"ضبطِ نفس کے بغیر حقیقت معلوم نہیں ہوسکتی۔ تم تو ایک ہی گردش میں چکر کھا کر بھول گئے"

طاسو بہت تیزی کے ساتھ چٹان پر چڑھ گیا۔ شعلے خاموش ہو گئے
فقیر کے بیٹھنے کی جگہ راکھ پڑی تھی۔ طاسو نے راکھ کو ہاتھ لگایا تو اُس سے
شعلے پیدا ہوئے اور طاسو کا چہرہ جھلس کر رہ گیا۔ طاسو کے غم کی کوئی انتہا نہ
تھی۔ جس خضرِ منزل اور عارفِ سالک کے لئے اُس نے اتنی مصیبتیں
جھیلی تھیں وہی جل کر ختم ہو گیا۔ مگر اب افسوس سے کیا ہو سکتا تھا۔ یہ
اُس کی تقدیر تھی کہ پیاسا دریا کے پاس پہنچا اور ندیا خشک ہو گیا،
طاسو کو ناکام واپس ہونا پڑا۔

سفر کی پیہم صعوبتوں کے بعد طاسو وطن پہنچا۔ مگر اُس کا چہرہ شعلوں
سے جھلس کر اتنا بدل گیا تھا کہ وطن کے لوگ تو ایک طرف رہے خود اُس
کے بیوی بچے اُس کو نہ پہچان سکے۔ جب اُس نے بات چیت کی اور اپنے
طاسو ہونے پر دلیلیں پیش کیں اور اپنے واقعات بتائے تو لوگوں
نے اُسے پہچانا۔

طاسو کے اس واقعہ کے بعد چین میں یہ کہاوت مشہور ہو گئی۔
"حقیقت کی تلاش آدمی کا حلیہ بگاڑ دیتی ہے"

خُون

سلیم کے باپ بیرسٹر تھے۔ شہر کے نامور وکلا میں اُنکا شمار تھا۔ قانون سے اُن کو طبعی مناسبت اور فطری دلچسپی تھی۔ خوش بیان، بذلہ سنج اور نکتہ رس بھی تھے ان خوبیوں نے اُن کو اپنے ہمعصر اہل پیشہ میں ممتاز بنا دیا۔ انکی وکالت کسی خاص نوعیت کے مقدموں تک محدود نہ تھی۔ دیوانی، مال اور فوجداری ہر قسم کے مقدمات میں پیروی کرتے اور کامیاب رہتے۔ بیرسٹر صاحب نے دماغ حاضر اور ذہنِ رسا پایا تھا۔ ابھی ابھی سشن میں قتل کے مقدمہ کی پیروی کر رہے ہیں اور یہاں کا کام پورا کر کے دوسری عدالت میں مال کے مقدمہ میں بحث کی۔ وہ اس قدر مدلل بحث کی کہ فریقِ مخالف کے وکیل بھی جھوم اُٹھے کہ یہ شخص صرف قانون دان ہی نہیں سحر بیان مقرر بھی ہے۔ کامیاب وکیل کے لئے صرف اچھا مقرر ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ زورِ فصاحت سے عوام کو متاثر کیا جاتا ہے مگر عدالت کے باخبر حکام پر یہ جادو بہت کم چلتا ہے وہاں تو فصاحت کے ساتھ قانونی نظیریں اور دلیلیں چاہئیں۔ صرف باتوں اور الفاظ کے بل بوتے پر کوئی مقدمہ مشکل ہی سے کامیاب ہو سکتا ہے۔

فوجداری مقدمات میں تو شیریں بیانی اور بذلہ سنجی کام دے جاتی ہے۔ لیکن دیوانی اور مال کے مقدموں میں ٹھوس قانونی حقائق کی ضرورت پڑتی ہے۔

بیرسٹر صاحب زیادہ وقت قانونی کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرتے۔ نئے نئے قانونی نظائر پڑھتے، سوچتے اور مقدموں میں حسب ضرورت اُن کا استعمال فرماتے۔ نظائرِ قانونی کا موقع محل سے استعمال کرنا بھی ہر وکیل کا کام نہیں ہے۔ بعض وقت تو کام کی نظیر یاد ہی نہیں آتی اور بحث کے بعد جب اُس کا خیال آتا ہے تو وکیل کو اپنے حافظہ پر جھنجلاہٹ آتی ہے کہ یہ ظالم حافظہ وقت پر دغا دے گیا۔ بہت سے ارباب قانون کو نظائر ازبر ہوتے ہیں مگر اُن کا صحیح استعمال نہیں کر سکتے —— لیکن بیرسٹر صاحب اس فن میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ شہر میں اُن کی آبرو کی جاتی تھی پبلک کے کاموں سے بھی دلچسپی تھی اور حکام بھی اُن سے خوش تھے بلکہ عزت کرتے تھے۔

بیرسٹر صاحب کے پیشہ کی تصویر کا یہ ایک رُخ تھا —— اُن کی زندگی —— سر سے پیر تک اپ ٹو ڈیٹ، مغربیت اُن کے خون کے ساتھ گردش کرتی تھی اور افرنگیت نے اُن کے دل و دماغ کو مسحور اور مغلوب کر لیا تھا۔ وہ زندگی کے ہر مسئلہ کو مغرب کی نگاہ سے دیکھتے اور فرنگی کے دماغ سے سوچتے۔ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئی تھے اور یہیں پرورش پائی تھی۔ لیکن انگلستان کے صرف چند سالہ قیام نے اُن کو قریب قریب انگلو انڈین بنا دیا۔ یورپ اور یورپ والوں کی تعریفیں

کرتے کرتے اُن کی زبان سوکھ جاتی۔ ہندوستان کو وہ نیم مہذب اقوام کا بڑا اعظم کہتے تھے۔ جس کو تمدنِ جدید کی ابھی تک ہوا نہیں لگی اور تہذیبِ نو کا سایہ تک نہیں پڑا۔ اس ذہنیت کا آدمی مذہبی ہو ہی نہیں سکتا! بیرسٹر صاحب مُنکرِ خدا تو نہ تھے مگر مذہب سے اُنہیں خاص دلچسپی نہ تھی۔ مغربی ادب بیرسٹر صاحب نے ضرورت سے زیادہ پڑھا تھا اس لئے مذہبی حقائق اُن کی نگاہ میں مشتبہ ہو گئے تھے۔

یورپ کے مؤرخین عام طور پر ذہین نکتہ رس اور شگفتہ قلم تو ہوتے ہیں مگر دیانت دار نہیں ہوتے۔ ایک کمزور سے اشارے کو وہ تاریخی حقیقت بنا دیتے ہیں اور ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے فن میں تو مہارتِ تامہ رکھتے ہیں۔ مغربی مؤرخین نے اسلام کی مقدس اور حسین تصویر کو ہمیشہ مسخ کر کے پیش کیا ہے۔ تہمتیں تراشی ہیں۔ الزام لگائے ہیں۔ واقعات کی غلط توجیہیں کی ہیں۔ بے سروپا نتائج نکالے ہیں —— بیرسٹر صاحب نے اسی قسم کی تاریخوں کو پڑھا تھا اور ایک ایک لفظ کو وحی والہام سمجھ کر پڑھا تھا۔ مشاہیرِ اسلام پر وہ اعتراض کرتے اور جو دل میں آتا کہہ دیتے —— اس لئے کہ مغربی لٹریچر ذہن وخیال کو عقیدت و ادب سے عاری کر دیتا ہے۔

سلیم اُن کا اکلوتا لڑکا تھا جس کی پرورش اُس کے ماموں کے یہاں ہوئی تھی۔ بات یہ ہوئی کہ بیرسٹر صاحب کے ولایت جانے سے قبل سلیم کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ سلیم اُس وقت بہت سے بہت آٹھ نو سال کا ہوگا! بیرسٹر صاحب ولایت جانے لگے تو سلیم کو اُس کے ماموں کے سپرد کر گئے۔ سلیم

کے ماموں کے گھرانے کا ماحول خالص مشرقی تھا۔ سلیم اسی مشرقی فضا میں بچہ سے جوان ہوا۔ مشرقیت اُس کی فطرت میں رچ گئی تھی اور اُس کے لوحِ دل و دماغ نے آثارِ مشرق کے سوا اور کوئی نقش ہی قبول نہ کیا تھا۔ بیرسٹر صاحب نے ولایت سے واپس آنے کے بعد سلیم کی تعلیم و تربیت پر کافی توجہ کی اور اُس کی فطرت کو مغربیت کے سانچے میں ڈھالنا چاہا۔ مگر سلیم پر یہ رنگ نہ چڑھ سکا۔ بچپن کی عادتیں مشکل ہی سے جاتی ہیں اور طبیعت اپنی افتاد کو شاید ہی بدلتی ہے۔ اوائلِ زندگی کے نقش بہت گہرے اور پائدار ہوتے ہیں۔ باپ کے کہنے سُننے اور توجہ کے اثر سے سلیم کوٹ پتلون پہننے لگا۔ ٹائی میں بہت خوشنما گرہ لگانی آگئی۔ انگریزی روانی کے ساتھ بولنے لگا۔ مگر اُس کا دل اب بھی مشرقی، ہندوستانی اور مسلمان تھا۔

بیرسٹر صاحب اپنے دوستوں سے کہتے تھے کہ سلیم کو اُس کے ماموں نے بگاڑ دیا۔ میں نے اُس کے بنانے کی بہت کوشش کی۔ میری کوشش سے سلیم سنبھل تو گیا مگر وہ نہیں بنا جو میں بنانا اور دیکھنا چاہتا تھا۔ ہر باپ کو اپنے بیٹے کی تندرستی کا خیال ہوتا ہے اور بیرسٹر صاحب کو خیال نہیں جنون تھا۔ کھانے پینے، سونے، ورزش کرنے اور لکھنے پڑھنے کا نقشہ (چارٹ) اُنہوں نے بڑی محنت کے ساتھ بنا کر بیٹے کو دیا تھا۔ اور ہاں! صرف یہی نہ تھا کہ ہدایات کا نقشہ سلیم کو سونپ کر وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے، بیرسٹر صاحب بیٹے کی نقل و حرکت پر نگرانی رکھتے کہ اُس نے کیا کھایا؟ کب سویا؟ کس وقت بستر سے اُٹھا؟ اُس کے دوست اُس سے کب اور کیوں ملنے کے لئے آئے؟

اتنی شدید نگرانی اور سخت پابندی سلیم کو یقیناً ناگوار تھی مگر اُس کی فطرت پر نام کا اثر پڑا تھا۔ وہ سلیم الطبع اور نیک طبیعت تھا۔ تمام ناگواریوں کے باوجود باپ کے حکم کا اُس نے ہمیشہ پاس کیا اور اُس کی نگاہیں باپ کے حکم پر جھکی رہیں اُٹھی نہیں ——— انگریزی کھانوں سے اُس کو رغبت نہ تھی مگر بیرسٹر صاحب ان کھانوں کے عاشق تھے۔ انتہا یہ ہے کہ ڈبہ کی بدبودار مچھلی وہ چٹخارے لے لے کر کھاتے اور تعریفیں کرتے! وہ احباب سے کہا کرتے کہ ہندوستانی کھانے ذہن کو کُند، طبیعت کو غبی اور معدے کو خراب کرتے ہیں۔ ان ہندوستانیوں کے تمدن کا سارا نظام ہی غلط ہے۔ اور یہ کھانے تو قاتلِ صحت ہیں۔ مسالوں کی وہ بھرمار ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ! زبان سے لے کر معدے تک ہر عضوِ بدن نکما اور برباد ہو جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کے کھانے اُس دورِ عشرت کی یادگار ہیں۔ جبکہ نادر شاہ کی جرّار فوج دہلی کے قریب آچکی تھی اور قلعۂ معلّٰی میں بادشاہ سلامت گانا سُن رہے تھے اور ناچ دیکھ رہے تھے۔

سلیم کو اپنے یہاں انگریزی کھانے بہرحال کھانا پڑتے ہندوستانی کھانوں میں زیادہ سے زیادہ پُلاؤ بیرسٹر صاحب کی میز پر کبھی کبھار ہوتا وہ بھی انگریزی باورچی کا پکا یا ہوا جس میں لندن اور دلّی کو سمونے کی ناکام کوشش کی جاتی۔ سلیم اپنے ماموں کے ہاں جاکر ہندوستانی کھانوں کا شوق پورا کرلیتا۔ زندگی کے یہی وہ مقامات ہیں کہ جہاں ضمیر؎

خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

پکار اُٹھتا ہے۔ ماموں کے یہاں کھانا کھاتے ہوئے وہ مسکرا کر کہتا۔ ساری دُنیا

ل کر بھی ہندوستانی قورمہ کا جواب پیش نہیں کر سکتی۔ اور صاحب یہ سیخ کے
کباب! میرا ایمان ہے کہ اگر سیخ کے گرم گرم کباب کھا کر آدمی مر جائے تو قسم خدا!
کی حساب کتاب کے بغیر اُسے بخش دیا جائے! شاعر نے "خالِ ہندو" پر سمر قند و
بخارا بخش دیا تھا اور میرا بس چلے تو مُرغِ مُسلّم کی ران پر مشرق و مغرب کو بے دریغ
نچھاور کر دوں۔ اور ہاں! دودھ کی داغ لگی کھیر۔ مٹی کے کورے کورے
سکوروں میں، لذّت کی جان! ذائقہ کی رُوح، زبان نہیں رُوح لذّت اندوز
ہوتی ہے کہ ایک بار کھائیے اور سو بار کھانے کی ہوس کیجئے ——— اِن تفصیلات
سے باپ بیٹے کے اختلاف طبائع کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے۔

دعوتیں، پارٹیاں اور جلسے مغربی تہذیب کا طرّہ امتیاز ہیں۔ بیرسٹر صاحب
تو تہذیبِ فرنگ کے فدائی تھے اس لئے ضیافتوں اور (Entertainments)
کی منزل میں اُن کو بہرحال پیش پیش ہونا چاہیئے تھا۔ آج کلکٹر صاحب کا ڈنر ہے
پرسوں سول سرجن دوپہر کے کھانے پر مدعو ہیں، شام کو کسی ڈیلیگیشن کے ممبروں
کو چائے پر بلایا گیا ہے۔ غرض دعوتوں کا سلسلہ اُن کے یہاں برابر جاری رہتا
ہے۔ بیرسٹر صاحب عوام و خواص میں مشہور بھی تھے اور مقبول بھی۔ لوگ تعریفیں
کرتے کہ بیرسٹر صاحب بہت حوصلہ مند، عالی ظرف اور متواضع ہیں۔
مہمان نوازی اور تواضع آدمی کو ہر دلعزیز ہی نہیں بناتی۔ بلکہ بُرائیوں پر پردہ ڈال دیتی

ہر آدمی کو اپنے ہم خیال اور ہم مزاج اشخاص سے دلچسپی ہوتی ہے۔ خلافِ
طبع افراد کو آدمی مشکل ہی سے گوارا کرتا ہے، چور دوسرے چور کی صحبت میں
بیٹھ کر خوش ہوگا، شرابی کو شرابی کی صحبت میں لطف آئے گا۔ عالم کو اہلِ علم

کی محفل پسند ہوگی۔ بات یہ ہے کہ انسان کی فطرت کی یہ خاصیت ہے کہ مخالف ومتضاد ماحول سے اُس کو وحشت ہوتی ہے۔ جاہل عالموں کے یہاں آکر خوش نہیں ہو سکتے۔ پاکبازوں کو رندوں کی محفل سازگار نہیں آسکتی۔ کسان تاجروں میں بیٹھ کر تنہائی اور اجنبیت سی محسوس کرتا ہے اور گویئے فلسفیوں کو جنس غیر سمجھتے ہیں۔ وہ جو کسی تجربہ کار نے کہا ہے کہ آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے تو اُس کا یہی مقصد ہے کہ دوستوں کے مزاجوں اور طبیعتوں میں یکسانی ہونا ضروری ہے۔ بیرسٹر صاحب کی دوستی بھی اُنہی لوگوں سے تھی جو مغربی تہذیب کے دلدادہ اور شیدائی تھے۔ اُن کے یہاں دعوتوں میں دوستوں کی بیویاں، لڑکیاں۔ بہنیں اور دوسری رشتہ دار عورتیں آتیں اور خوب بے تکلفی کی باتیں ہوتیں۔

سلیم کو یہ ملی جلی دعوتیں پسند نہ تھیں۔ شوخ اور بے باک عورتوں کے جھرمٹ میں باپ کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے اُسے شرم محسوس ہوتی لڑکیاں سلیم کی بے تعلق اور کھنچا ہوا دیکھ کر خود اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتیں مگر سلیم کو اس ذہنیت کی عورتوں سے دلچسپی نہ تھی۔ انسان کی زندگی میں سارا کھیل دل کے لگاؤ کا ہے۔ طبیعت کا میلان نہ ہو اور دل میں نفرت پیدا ہو گئی ہو تو عورت خود بھی اپنی تمام کافر ادائیوں کے باوجود کسی مرد کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔ لڑکیاں اُس سے باتیں کرتیں تو اخلاقاً وہ جواب دیتا مگر اس انداز میں د۔

"مسٹر سلیم! ہالی وڈ کا شہرۂ آفاق فلم آپ نے دیکھا تو ہوگا؟ نام

شہر میں اُس کی دھوم مچی ہے۔"

"فلمی دُنیا سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"آپ اپنی تصویر مجھے دے سکتے ہیں؟ میں اُسے اپنے البم کی زینت بناؤں گی۔"

"میں نے ساری عمر میں دو مرتبہ تصویر کھچوائی ہے۔ اور وہ دونوں تصویریں ضائع ہو گئیں۔"

"ایل۔ایل۔بی کے بعد انگلستان تو ضرور جائیں گے؟"

"حالات اس کا فیصلہ کریں گے۔"

"آپ کو کس وضع کی آنکھیں پسند ہیں؟"

"میں نے اس مسئلہ پر آج تک غور نہیں کیا۔"

"کل شام کو رائے بہادر صاحب کی پارٹی میں آپ تشریف لا رہے ہیں؟"

"جی نہیں!"

"آپ نے اس انداز میں جواب دیا جیسے کہ رائے بہادر صاحب کو آپ ناپسند کرتے ہیں؟"

"کل ہمارے محلہ میں ریڈنگ روم کا افتتاح ہوگا۔ میری اُس میں شرکت ضروری ہے۔"

سلیم جوان تھا اور اُس کا سینہ بھی دوسرے جوانوں کی طرح جذبات کا آتشکدہ تھا۔ اچھی صورت دیکھکر وہ بھی خوش ہوتا۔ حسین مسکراہٹوں میں اُس کے لئے یقیناً کشش تھی۔ پنڈلیوں کا لوچ، گردن کا خم اور باہوں کی

لچک اُس کو متاثر کرتی تھی - جوانی ہر لمحہ لذتیں چاہتی ہے - شباب کی سب سے بڑی تمنّا یہ ہوتی ہے کہ چٹخاروں کا طوفان اُس کے سر سے گزر جائے - جوان جذبات نچلے رہ ہی نہیں سکتے - بے چینی اُن کی خاصیت ہے اور وہ ؛-

ع آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب

رہتے ہیں - سلیم صحت ور نوجوان تھا - خوش منظر ہنس مکھ اور سادہ مزاج - ناتجربہ کاری نے اسے دوسرے جوانوں کی طرح حُسن پرست تو ابھی تک نہ بنایا تھا - مگر وہ حُسن دوست ضرور تھا - لیکن مغرب زدہ عورتوں کی ہر ادا میں اُسے بناوٹ نظر آتی تھی - اسی لئے نیم برہنہ سینے ، عُریاں پنڈلیاں شوخ مُسکراہٹیں ، بے باک چھیڑ چھاڑ - اُسے چونکا تو دیتیں مگر اپنی طرف کھینچ نہ سکیں - جنسی جذبات اور صنفی میلانات بہت زیادہ نازک ہوتے ہیں - ذرا سی ٹھیس سے یہ کارگہہ شیشہ گراں چکنا چور ہو جاتا ہے

سلیم وکالت کے آخری سال میں تھا - بیرسٹر صاحب کو بیٹے کی شادی کی فکر تھی - کنبے میں بہت سی لڑکیاں موجود تھیں مگر بیرسٹر صاحب ہندوستانی لڑکی کو گڑیا کہا کرتے تھے جو صرف طاقچوں کی زینت بن سکتی ہے - زندگی کی کش مکش میں مرد کا ایک قدم بھی ساتھ نہیں دے سکتی ہے - اُن کو ایسی مہذب بہو کی تلاش تھی کہ جو سسرال میں آئے تو لوگوں کو ایسا محسوس ہو کہ دُلہن نہیں کسی فوج کا کمانڈر آ گیا - بیرسٹر صاحب کے دعوتوں اور پارٹیوں

کی بھرمار ہونے لگی۔ بن بیاہی لڑکیاں خاص طور پر ان دعوتوں میں شریک ہوتیں۔ بیرسٹر صاحب چاہتے تھے کہ سلیم خود ہی کسی لڑکی کو پسند کرلے اور شادی ہو جائے۔ اپنی پسند کی بیوی سے ہر شوہر خوش اور مطمئن رہتا ہے۔۔۔ تو یہ دعوتیں کیا تھیں یوں سمجھئے کہ شادی کے لئے زمین ہموار کی جارہی تھی۔

بیرسٹر صاحب دوسرے لوگوں سے سلیم کو سنانے کے لئے فرماتے:۔

"ارے صاحب! یہ ہندوستان بھی عجیب خطہ ہے۔ شادی بیاہ کے معاملے میں لڑکے اور لڑکی سے پوچھا تک نہیں جاتا جس لڑکی سے جس لڑکے کا چاہا بیاہ کردیا نہ وہ ایک دوسرے کی عادت اور مزاج سے واقف ہوتے ہیں نہ اُن کو ایک دوسرے کا ذوقِ فطری اور رجحانِ طبع معلوم ہوتا ہے غضب خدا کا دولہا کو دلہن کی صورت نہیں دکھائی جاتی اور بے چاری دولہن تو سچ مچ کی گڑیا ہوتی ہے۔ جس گدّے کے ساتھ چاہا اُس کا نکاح پڑھا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر رشتے اَنمل بے جوڑ ہوتے ہیں۔ گھرانوں میں لڑائیاں رہتی ہیں کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔ شوہر بیوی سے ناخوش بلکہ متنفر اور بیوی میاں سے غیر مطمئن! ہندوستانیوں کے گھر جہنم سے بدتر ہو جاتے ہیں۔ میاں بیوی کے تعلقات کی اس ناخوشگواری کا اثر

دُو خاندانوں پر پڑتا ہے۔ جُڑے ہوئے دل ٹوٹ جاتے ہیں اور دوست دشمن بن جاتے ہیں۔"

ہندوستان کی بُرائی کے بعد بیرسٹر صاحب یورپ کی تعریفیں کرنے لگے :—

"یورپ میں چٹ منگنی اور پٹ بیاہ نہیں ہوتا۔ وہاں شادی سے پہلے لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کے عادات و اطوار سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ مزاج وطبیعت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ جب دو دل مل جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت اُنہیں شریکِ زندگی ہونے سے روک نہیں سکتی۔ یورپ کے ازدواجی تعلقات مستحکم بُنیادوں پر ہوتے ہیں۔ رضا و رغبت اور ذاتی پسندیدگی وانتخاب کی بنیاد پر! وہاں کی بیوی مرد کے دل بہلانے کا کھلونا نہیں اُس کی شریکِ کار ہوتی ہے۔"

سلیم نادان نہ تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اُس کے باپ اور لوگوں سے یہ جو کچھ فرما رہے ہیں، اُس کا روئے سخن میری طرف ہے۔ باپ کی باتیں وہ توجہ کے ساتھ سُنتا۔ اُس نے کبھی بیرسٹر صاحب کی گفتگو اور طویل سے طویل گفتگو پر بھی غیر دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ سلیم جانتا تھا کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کا بُرا نہیں چاہ سکتا۔ دنیا میں یہی اور

صرف یہی ایک ایسا رشتہ ہے جو خود غرضی اور رشک و رقابت سے
پاک ہوتا ہے۔ بیرسٹر صاحب کے یہ خیالات نیک نیتی اور خیرخواہی
پر مبنی ہیں۔ مگر نیک نیتی کے باوجود آدمی غلطی بھی کر سکتا ہے۔ باپ
کی اس غلط آمیز نیک نیتی کا اُس نے ہمیشہ احترام کیا۔

سلیم کے ماموں کی لڑکی نوشابہ قبول صورت سے زیادہ خوش
سلیقہ اور عادات و اطوار کی بہت ہی سلیس اور نیک تھی۔ سلیم
نے بچپن سے لے کر آغازِ شباب تک ماموں کے یہاں پرورش
پائی تھی۔ نوشابہ سے وہ مانوس تھا۔

افسانہ نگار نے لفظ "مانوس" جدید لٹریچر اور ترقی پسند ادب
کے معنیٰ میں استعمال نہیں کیا ——— ترقی زدہ ادب کے زاویۂ نگاہ
سے جب کوئی مرد کسی عورت سے مانوس ہو جاتا ہے تو اُس اُنس و دلچسپی
میں کم سے کم ہوسناک انگڑائیاں اور جذباتی جماہیاں شامل ہوتی
ہیں۔ مگر سلیم کی فطرتِ مانوس سادہ و بے رنگ تھی۔ وہ نوشابہ کو
پسند کرتا تھا اور اس پسند و انتخاب نے بے چینی اور اضطراب کی
صورت کبھی اختیار نہیں کی۔ وکالت کے امتحان میں کامیابی کے بعد
جب اُس کے باپ لڑکیوں کو دعوتوں میں بلاتے اور کورٹ شپ کے
مواقع مہیا کیے جانے لگتے تو وہ اپنی شادی کے مسئلہ پر بہت سنجیدگی
کے ساتھ غور کرنے لگا۔

سلیم اب وکیل ہو چکا تھا۔ جنگ چھڑنے کے سبب ولایت جانا

نہ ہوسکا۔ باپ کے ساتھ مل کر وطن ہی میں کام شروع کر دیا۔
شادی کا ذکر اور خیال آتے ہی نوشابہ اُس کی نگاہوں کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی —— خیالی تصویر، پیکرِ تصوّر، مجسّمۂ وہم و تخئیل —— مگر خیالی تصویر پر غور کرتے کرتے اور پیکرِ تصوّر کو دیکھتے دیکھتے یہ عالم ہو جاتا ہے کہ:۔

ے تصوّر کو مجسّم کر دیا
جذبۂ دل! بڑھ کے دامن تھام لے

یہاں تک کہ:۔

ے میں اور ترے ہجرِ مسلسل کی شکایت
تیرا ہی تو عالم ہے تری یاد کا عالم

سلیم کی طبیعت کا میلان نوشابہ کی جانب بڑھتا جا رہا تھا۔ جس اُفتادِ مزاج، اندازِ طبیعت اور اسلوبِ رفتار و گفتار کی لڑکی کو وہ پسند کر سکتا تھا۔ نوشابہ میں وہ تمام باتیں موجود تھیں۔ سلیم ماموں کے یہاں یوں بھی آیا جایا کرتا تھا مگر اس دلچسپی کے بعد وہ بکثرت جانے آنے لگا۔ سلیم نے زبان سے کچھ نہیں کہا، حرفِ تمنّا سے اُس کے لب ہنوز نا آشنا تھے۔ لیکن اُس کے انداز نوشابہ کے گھر والوں سے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ سلیم کی چشمِ انتخاب نوشابہ پر ہے۔

سلیم کے ماموں اور ممانی میں اس موضوع پر بارہا گفتگو ہوئی دونوں

نے اس رائے کا اظہار کیا کہ نوشابہ کا رشتہ اگر سلیم کے ساتھ ہو جائے
تو یہ ہماری عین خوشی کا سبب ہوگا۔ دیکھا بھالا لڑکا اور اپنا ہی خون
ہے۔ مگر ہندوستان میں لڑکی والے اپنی طرف سے شادی بیاہ
کی بات چیت میں پہل نہیں کرتے۔ پھر سلیم کے ماموں کو اپنے بہنوئی
بیرسٹر صاحب کی طبیعت کا بھی اندازہ تھا کہ وہ تو کوئی کرسٹان
قسم کی بہو اپنے بیٹے کے لئے لائیں گے۔ پردہ نشین لڑکی اور وہ بھی
صرف اُردو فارسی لکھی پڑھی اُن کے انتخاب میں آ ہی نہیں سکتی۔
نوشابہ کے لئے بہت سی جگہ سے پیغام آئے۔ لیکن سلیم کے
ماموں نے انکار کر دیا۔ بھانجا اُن کی نگاہ میں تھا۔ وہ اس اُمید میں تھے
کہ ممکن ہے بھانجے کی دلچسپی اور پسندیدگی سے واقعات کا رُخ
بدل جائے۔ ابھی نوشابہ کی عمر بھی کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے۔ دو ایک
سال انتظار کیا جا سکتا ہے۔

سلیم سے نوشابہ کا پردہ تھا۔ کبھی کبھار ایسا ہو جاتا کہ سلیم آواز
دے کر ماموں کے مکان کے صحن میں آیا اور نوشابہ کی جھلک نظر آ گئی
——— مُبہم جھلک، پرچھائیں، سیمیائی نمونہ ——— دوپٹہ کا
آنچل، اُنگلیوں کے پورے، یا زیادہ سے زیادہ چہرے کا منظر ناتمام۔
سلیم کے لئے یہ کبھی کبھار کی جھلکیاں اور جلوۂ گاہ گاہ ہی بہت کچھ تھا۔
اس سے زیادہ تجلّی کی اُسے تمنّا بھی نہ تھی۔ سلیم کا جذبۂ شوق معصوم تھا۔
اور عصمتِ شوق کی سطح تاک جھانک سے بہت بلند ہوتی ہے۔ جذبات

اگر آلودۂ ہوس نہ ہوں تو دل کی نزاکتیں زندگی کو پُرسوز اور پُرلطف بنا دیتی ہیں۔

سلیم کو محبت نہیں دلچسپی تھی۔ اُس کا دل نوشابہ کو شریکِ زندگی بنانا اور دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر اس منزل میں باپ کی رضامندی سنگِ گراں تھی۔ کسی سے تعلقِ خاطر ہونے کے بعد مشکلیں سامنے آئیں تو اس تعلق و دلچسپی میں اور رجحان پڑ جاتی ہے۔ سلیم کی طبیعت کا بھی یہی رنگ تھا۔ نوشابہ پردے کی آڑ سے گاہے ماہے اُس سے بات چیت بھی کر لیتی۔ مگر یہ گفتگو گھریلو انداز کی ہوتی :-

"پھوپھا جان تو اچھے ہیں؟ آپ کی وکالت کا کیا حال ہے؟ شہر میں ہڑتال کب تک رہے گی؟ سونے کا بھاؤ سنا ہے ایک سو سے اوپر پہنچ گیا۔"

سلیم بھی مختصر اور سادہ جواب دیتا۔ مگر ایک دن نوشابہ کے "بھائی جان" کہنے پر سلیم کی زبان سے بے ساختہ نکل ہی گیا :-

"تم مجھے اب بھائی جان نہ کہا کرو۔ سلیم کہو۔ یہ میرا نام ہے۔ سمجھ گئیں!"

سلیم کے ان چند لفظوں نے نوشابہ کو کسی اور عالم میں پہنچا دیا۔ اُس کے کانوں میں نہ جانے کب تک یہی صدا گونجتی رہی۔ وہ معصوم اور پاکباز تھی۔ البتہ وقوف اور ناسمجھ نہ تھی۔ اور فراستِ معصوم اور دانشِ پاکباز عقلِ عیار سے زیادہ معاملہ فہم ہوتی ہے۔ سلیم کے منہ سے یہ جملے سُن کر اُس

کی مسرت کا دماغ آسمان پر پہنچ گیا۔ اُس نے تنہائی میں نہ جانے کتنی بار تسلیم کے جملوں کو دُہرایا اور فرطِ غیرت سے خود ہی شرما کر رہ گئی۔

بیرسٹر صاحب کے یہاں پارٹیوں میں دو عورتیں عام طور پر شریک ہوتیں۔ ایک سول سرجن کی لڑکی اور دوسری انکم ٹیکس افسر کی بیوی! ڈاکٹر کی لڑکی کا نام جمیلہ تھا اور انکم ٹیکس آفیسر کی بیوی مسز ریاض ریاضی کے نام سے مشہور تھی۔

نئے لوگ ریاضی کے نام پر چونکتے کہ یہ بالکل نئی قسم کا نام ہے۔ اگر ناموں میں جدت اور تنوع کو جائز رکھا گیا تو پھر تاریخ، جغرافیہ، اور سائنس بھی عورتوں کے نام رکھے جائیں گے۔ مگر جب اُن کو یہ معلوم ہوتا کہ ان خاتون صاحبہ کے شوہر کا نام ریاض ہے اور اسی نسبت سے ان کو ریاضی کہا جاتا ہے تو وہ مسکرا دیتے۔

جمیلہ خوب صورت اور سلیقہ مند لڑکی تھی۔ اور فیشن پرستی کا تو یہ عالم تھا کہ کپڑوں کی تراشں کے نئے نئے ڈیزائنوں کا آغاز اسی کے جسمِ نازنین سے ہوتا۔ دوسری عورتیں جمیلہ کی نقل کرتیں فیشن کی منزلِ رنگیں کی وہ امیرِ کارواں تھی۔ اُس کے بدن پر لباس پہننا بھی تھا۔ خوش نما لباس اُس کو بہت۔ وہ جاذبِ نظر بنا دیتا۔

جمیلہ بیرسٹر صاحب کے یہاں آتی اور خاص طور پر تسلیم سے بات کرتی۔ بیرسٹر صاحب بھی چاہتے تھے کہ تسلیم اُس سے مانوس

ہو جائے - اور دونوں ایک دوسرے کو پسند کرلیں تو یہ رشتہ بہت
خوب رہے گا - لڑکی پڑھی لکھی، صورت شکل کی اچھی، سلیقہ مند اور
معزز باپ کی بیٹی ہے - آنے جانے اور بات چیت کرنے سے تھوڑی
بہت دلچسپی پیدا ہو ہی جاتی ہے - سلیم اب ذرا توجہ کے ساتھ جمیلہ سے
پیش آنے لگا - جمیلہ کے لئے یہ ذرا سی توجہ ہی بہت کچھ تھی - اُس نے سلیم کی
توجہ کے سہارے بڑھنا چاہا - بے تکلفی بڑھانے کی کوشش کی اور اُس سے
قریب تر ہونے لگی -

جمیلہ ہوشیار اور مزاجدان تھی سلیم کی طبیعت کا رنگ دیکھ کر وہ انتہائی
سنجیدہ بنی رہتی - سلیم کے تیور دیکھ کر مسکراتی اور اُس کے چشم و ابرو کی شہ
پاکر ہنستی - اُس نے اپنے کو بدل سا دیا تھا - وہ جوانی جو برسوں بے نقاب
رہی ہو - جسے جوان مردوں کی محفلیں میسّر آئی ہوں - اچھوتی رہ ہی نہیں سکتی -
اگر رکاوٹیں اور غیر معمولی موانع پیش آتے رہیں اور بہت زیادہ احتیاط سے
کام لیا جائے تو عملی نہ سہی خیالی طور پر ایسی زندگی ضرور آلودہ ہو جاتی ہے سلیم بھی
جمیلہ سے ملتے ہوئے اجنبیت اور وحشت محسوس نہ کرتا - اور اسے حیرت
ہوتی تھی کہ ایک مغرب زدہ لڑکی اتنی سنجیدہ اور ریزرو (reserved)
کس طرح ہو سکتی ہے ؟

انکم ٹیکس آفیسر کی بیوی ریاضی بھی سلیم کی طرف مائل تھی - شوہر رکھنے کے باوجود
وہ لوگوں سے ملنے جلنے میں غیر محتاط تھی اور جو شوہر دار عورت غیر مرد کی مسکراہٹ سے
لطف اندوز ہو سکتی ہے اُس سے ہر بے اعتدالی اور بے وفائی کی توقع کی جا سکتی ہے -

مسٹر ریاض دوسری حسیناؤں سے پینگیں بڑھاتے تھے اور بیوی چونکہ تہذیب زدہ تھی اس لئے وہ اس منزل میں شوہر سے پیچھے رہنا اپنی آزادی اور حقوق کی توہین سمجھتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو ڈھیل دے رہے تھے۔ ریاضی بہت زیادہ حسین تھی اور اُس کی اداؤں میں قیامت کی کشش تھی۔ اُس کے سیدھے رُخسار پر چوٹ کا نشان تھا جو اس رنگت اور صحت پر اور زیب دیتا تھا۔

بیرسٹر صاحب نے بیوی کے مرنے کے بعد بیاہ نہیں کیا مگر اب چند دن سے وہ تنہائی سی محسوس کرنے لگے۔ رنگین صحبتوں میں کون مرد اپنے دل و نگاہ پر قابو رکھ سکتا ہے۔ وہ بھی ان صحبتوں اور رنگین نشستوں سے لطف اندوز ہوتے ——— باتیں، قہقہے، چھیڑ چھاڑ، پھبتیاں ——— اتنی لذّتیں بھی کم نہیں ہوتیں۔ بیرسٹر صاحب کی توجہ کا مرکز ریاضی تھی وہ اُس سے خوب گھل مل کر باتیں کرتے اور موقع پا کر چھیڑتے۔ ریاضی اپنے عاشقِ بزرگ و محترم کے صاحبزادے سلیم کو چاہتی تھی سلیم اُس سے جتنا کھنچتا اُتنا ہی وہ اُس کی طرف بڑھتی۔ ریاضی کو اپنی پسپائی اور حُسن قیامت آفریں کی شکست پر حیرت ہوئی کہ تمام دُنیا اُس کی طرف جھکی جا رہی ہے۔ ہر شخص اُس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ خوبصورت کنواری لڑکیوں کے ہوتے ہوئے لوگ اُس کی قدر کرتے ہیں مگر یہ سلیم ہے کہ توجّہ ہی نہیں کرتا۔ عورت کا ارادہ پہاڑوں کی طرح اٹل اور طوفان کی مانند شدید ہوتا ہے۔ بس اب سلیم کو رام کرنے کی اُسے دُھن تھی۔

ریاضی نے اس مسئلہ پر تنہائی میں غور و خوض کیا؟ دل نے کہا کہ سلیم نیک طبیعت اور سنجیدہ نوجوان ہے۔ ایک شوہر دار عورت

سے ربط ضبط بڑھانے جھجکتا ہے؟ وہ کچھ سوچ کر مسکرائی۔ یہ قصّہ بھی آسانی سے ختم ہو سکتا ہے۔ مسٹر ریاض اب غیر عورتوں کے چکّر میں پھنس کر مجھ سے بے تعلق سے ہو گئے ہیں۔ میاں بیوی کے تعلقات بس نام ہی کے رہ گئے ہیں۔ میرے اور اُن کے مزاج نے آج تک میل ہی نہیں کھایا۔ میں زمین کی کہتی ہوں اور وہ آسمان کی! اُن کے یہاں مجھے خاص آرام بھی نہیں ہے۔ آدھی تنخواہ کی تو وہ شراب پی جاتے ہیں۔ اِس کش مکش، اُلجھن اور گھُل گھُل کر مرنے سے آخر کیا فائدہ؟ اس کمزور سے رہے سہے رشتے ہی کو کیوں نہ توڑ دیا جائے۔ میں پھر آزاد ہو جاؤں گی! اور ایک آزاد اور حسین عورت سے سلیم ضرور التفات کرے گا۔ سلیم جانتا ہے کہ میں اب ایک غیر مرد کے اختیار میں ہوں اور اُس وقت میں اپنے سوا کسی کی نہ ہوں گی۔ بس اُس کی جو مجھے اپنا بنا سکے۔

دونوں طرف سے دِلوں میں گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ ریاض اور مسز ریاض دونوں ایک دوسرے کو اپنی آزادی اور رنگ رلیوں کی راہ میں سنگِ گراں سمجھتے تھے۔ ریاضی نے کسی بات پر قصداً جھگڑا نکالا۔ دوسری طرف سے سخت جواب دیا گیا۔ عمل اور ردِّ عمل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ریاضی قطعِ تعلق کی اسکیم پہلے سے بنا چکی تھی۔

عورت جب ازدواجی تعلق باقی رکھنا نہ چاہے اور اُس کی طرف سے جب بدمزگی کی ابتدا ہو تو شاید آسمانی فرشتے بھی تعلقات کے

اس آئینہ خانہ کو ٹوٹنے سے نہیں بچا سکتے۔ دو تین دن کی جنگ کے بعد افتراق ہو گیا۔ اور ریاضی آزاد ہو گئی۔ خواہشوں سے آزاد نہیں! صرف شوہر کے دامِ تعلق سے آزاد!

سلیم نے اب بھی اُس کی طرف توجہ نہ کی بلکہ وہ یہ دیکھ کر کہ ایک عورت نے بیٹھے بٹھائے اپنے خاوند سے طلاق لے لی اور وہ پر قینچ کبوتری کی طرح ماری ماری پھرتی ہے، اُس کی جانب سے اور بدگمان بلکہ متنفر ہو گیا۔

جمیلہ سے اُس کے تعلقات خوشگوار تھے اور اِن نئے تعلقات کی رَے اتنی بڑھی کہ ماموں کے یہاں جانے کی اُسے فرصت ہی نہ ملی۔ مردوں کی دلچسپیوں کے مرکز بہت جلد جلد بدلتے رہتے ہیں۔ اس طرف ریاضی اور جمیلہ ایک دوسرے کے رقیب تھے۔ دوسری طرف بیرسٹر صاحب کی ہوسناک محبت کی دخل در معقولات نے ایک اور سوانگ کھڑا کر دیا تھا۔ تیسری جانب سلیم کے ماموں اور گھر والوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ سول سرجن کی لڑکی جمیلہ سے سلیم کی اِن دنوں گہری چھن رہی ہے۔

مسلسل کئی ہفتوں کی غیر حاضری کے بعد ایک دن سلیم ماموں کے یہاں پہنچا۔ دروازے پر پہنچکر اُس کے پاؤں بوجھل سے ہو گئے۔ اُس کا دل ندامت سی محسوس کر رہا تھا۔ ماموں اور ممانی سے ملاقات ہوئی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ سلیم کے ماموں صاحب ظرف اور بلند فطرت تھے۔ شرافت اُن کے رگ و ریشہ میں بسی تھی۔ اُنہوں نے سلیم سے ایک لفظ بھی جمیلہ سے تعلقات

کے بارے میں اشارۃً اور کنایۃً نہیں کہا۔ اُن کے اندازِ گفتگو اور برتاؤ
میں ذرّہ برابر فرق نہ تھا۔ چلتے ہوئے نوشابہ نے پردہ کی آڑ سے
مزاج پُرسی کرتے ہوئے بس اتنا کہا:-

"کہئے! آپ کی جمیلہ تو اچھی طرح ہیں؟"

سلیم کو پسینہ آگیا۔ اُس کے پاؤں کانپنے لگے۔ جملہ نہ تھا بجلی تھی جو
ایکا ایکی گری اور اپنا کام کرگئی۔ جمیلہ کی طنزِ سادہ میں نشتر چھپے تھے۔
جن کی چبھن سلیم نے محسوس کی۔ وہ اپنی زندگی پر افسوس کرنے لگا۔
کہ ایک آزاد لڑکی سے تعلّقات بڑھا کر اُس نے ایک معصوم اور امیدوار
دل کو دُکھایا۔

تعلّقات بڑھا کر گھٹانا وضعداری اور شرافت کے خلاف ہے۔
سلیم بڑی کشمکش میں تھا کہ کروں تو کیا کروں؟ نوشابہ کا طنز آمیز
چُبھتا فقرہ اُسے خوابِ غفلت سے چونکا چکا تھا۔ جمیلہ سے اب
بے تکلّفی کے ساتھ ملنے کو نوشابہ کی حق تلفی سمجھتا تھا۔ اور شریفوں کی
نگاہ میں حق تلفی بہت بڑا گناہ ہے۔

جمیلہ سلیم سے متعارف ہونے کے بعد بہت کچھ سنجیدہ بن کر سوسائٹی
سے الگ تھلگ سی رہنے لگی مگر نوجوانی کی رنگینیوں نے اُسے پھر اُکسایا
اور ماضی کی لغزشوں نے اُس کے جذبات کا دامن تھام کر کہا کہ ہمیں پھر
دُہراؤ۔ سلیم نے جمیلہ کی طبیعت کا یہ رنگ دیکھ کر اُس سے کھنچا رہنا شروع کیا۔
وہ تو خدا سے چاہتا تھا کہ تعلّقات جتنے کم ہوں اُتنا ہی اچھا ہے۔ سلیم اب تک

صرف وضعداری نباہ رہا تھا۔ ورنہ اُس نے جمیلہ کو دھوکا نہیں دیا اُس نے کبھی کھُول کر بھی یہ نہیں کہا کہ میں تم کو چاہتا ہوں، تمہیں پسند کرتا ہوں۔ یا تمہارے ہجر میں بے قرار رہتا ہوں۔ اُس کی پسندیدگی اور دلچسپی سادہ باتوں تک محدود تھی۔ جمیلہ نے اُس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا اور باتوں ہی باتوں میں سب کچھ کہہ دیا۔ جمیلہ اب دوسرے دوستوں سے پارٹیوں میں ذرا بے تکلف ہو کر ملنے لگی۔ اور سلیم کو ایک بہانہ ہاتھ آگیا۔

ریاضی باوجود ٹھکرائے جانے کے ابھی تک اسی تمنا میں تھی کہ اُس کا حُسنِ بے پناہ کبھی نہ کبھی سلیم کو ضرور متاثر کرے گا اور اُس کی زلفِ گرہ گیر سے سلیم کا طائرِ دل بچ نہیں سکتا۔ دوسری طرف بیرسٹر صاحب ریاضی پر ڈورے ڈال رہے تھے۔ اور اُنہوں نے شادی کے لئے اپنا ارادہ ظاہر کر دیا تھا۔ ریاضی نے اچھے خاصے خاوند کو بیرسٹر صاحب کے لئے نہیں چھوڑا تھا اُس کی تمناؤں کا مرکز تو سلیم کی جوانی تھی۔ جمیلہ سے وہ جلنے لگی اور جمیلہ ریاضی کی طرف سے کھٹکنے لگی۔ دوحسینائیں اور ایک کبوتر! دو شکاری اور ایک ہرن!

سلیم نے نوشابہ سے شادی کرنے کا عزم بالجزم کر لیا۔ باپ سے وہ کھُل کر باتیں نہ کر سکتا تھا۔ دوسرے آدمیوں سے کہلوایا تو بیرسٹر صاحب چراغ پا ہو گئے۔ کہ میں اپنے بیٹے کی زندگی تباہ کرنا نہیں چاہتا۔ قدامت تہذیب کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ جہالت اور تعلیم کے مزاج ایک دوسرے سے مل ہی نہیں سکتے۔ اندھیرے اور اُجالے کا ایک وقت میں ایک جگہ رہنا نہیں ہو سکتا۔ حُسنِ اتفاق سے

ضلع میں ایک ہندوستانی کلکٹر بدل کر آ گئے جن سے بیرسٹر صاحب کے بہت اچھے تعلقات تھے اور سلیم کو بھی وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ سلیم نے اُن سے اپنا حالِ دل کہہ دیا۔ کلکٹر صاحب نے وعدہ کیا کہ میں بیرسٹر صاحب کو راضی کر لوں گا تم اطمینان رکھو۔ شادی بیرسٹر صاحب کی نہیں، تمہاری ہوگی اور تمہیں اپنی مرضی اور پسند کی بیوی کا اختیار ہے۔

کلکٹر نے بیرسٹر صاحب کو جیسے تیسے راضی کر لیا اور آخر سلیم کی شادی نوشابہ کے ساتھ ہو گئی۔ سلیم کے ماموں نے بھتیجی کے بیاہ میں حیثیت سے زیادہ خرچ کیا۔ سب لوگ واہ واہ کرنے لگے اور ہر طرف تعریفیں ہونے لگیں۔

نوشابہ کے بیاہ نے جمیلہ اور راضی کی تمناؤں کے قلعوں کو مسمار کر دیا۔ وہ دونوں کلیجہ مسوس کر رہ گئیں۔ سچی محبت سود و زیان اور انتقام کے جذبات سے پاک ہوتی ہے۔ اگر محبت میں صداقت ہوتی تو سلیم اب بھی اُن کی نگاہ میں محبوب ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہاں تو جذبات ہی جذبات اور ہوس ہی ہوس تھی۔ جمیلہ اور راضی جو آج تک رقابت کی آگ میں جل رہی تھیں اور ایک دوسرے کی حریف تھیں، سلیم سے انتقام لینے کے لئے متحد ہو گئیں۔ اُنہوں نے دل کی تسلی اور ضمیر کو دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے سے کہا کہ سلیم نے ہم سے شادی کا وعدہ کیا تھا، قسمیں کھائی تھیں کہ میری زندگی میں تمہارے سوا کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔ مگر وہ جو کسی نے کہا

اپنا دردِ دل کسی سے کہہ بھی نہ سکتا تھا۔ سب سے بڑی رازدار اُس کی بیوی تھی مگر وہ اُس سے یہ کہتا تو خود اُسکے باپ کی سُبکی ہوتی کہ میری سوتیلی ماں اب سے چند دن پہلے مجھ پر چشمِ توجہ رکھتی تھی۔ سلیم کا غم ناگفتہ، قابلِ رحم اور لائقِ ہمدردی تھا۔ مگر اب ہمدردی کرنے سے ہو بھی کیا سکتا تھا۔ بیرسٹر صاحب کے لئے ریاضی نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ بہت دنوں کی اُمیدواری اور کوشش کے بعد نوگُلِ مراد اُن کے دامنِ شوق کی زینت بنا تھا۔

ریاضی چند دن خاموشی کے ساتھ بیرسٹر صاحب، سلیم اور نوشابہ کے مزاجوں کا اندازہ کرتی اور اُن کی طبیعتوں کا رنگ دیکھتی رہی۔ زمانہ بڑی کاری اور گہری زخموں کو بھر دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ بُرائی بھی گوارا ہو جاتی ہے۔ سلیم نے یہ سوچ لیا کہ باپ کے ساتھ رہنا ہے اور اُن کی خوشی منظور ہے تو اُن کی منظورِ نظر کی معیت کو بھی بہر حال گوارا کرنا ہوگا۔ وہ اب ریاضی سے گھر کے کاروبار کی باتوں میں مشورہ بھی کرنے لگا۔ پہلی سی نفرت اور بیزاری باقی نہ رہی تھی۔ ریاضی نے کچھ ایسا انداز اختیار کیا جس نے سلیم کے دل میں یہ بات بٹھادی کہ وہ میری بہت ہمدرد اور بہی خواہ ہے۔ ریاضی جی ہی جی میں خوش ہو رہی تھی کہ انتقام کے لئے زمین ہموار ہو گئی اور سازشوں کی بارود بچھائی جا چکی ذرا شتابہ لگانے کی دیر ہے۔

ریاضی کے ساتھ جمیلہ بھی اس سازش میں شریک تھی۔ اس ڈرامہ کی ہیروئن تو ریاضی ہی تھی ہاں ضرورت کے لئے "Side Part" جمیلہ کو بھی دیدیا گیا تھا۔ ریاضی نے جمیلہ سے کہا کہ تم کسی طرح بیرسٹر صاحب کے منھ سے نوشابہ کے حُسن کی تعریف سلیم کے سامنے کرادو۔ جمیلہ نے کہا کہ یہ کونسی بڑی بات ہے۔

ہے کہ گھٹنے پیٹ کی طرف جھکتے ہیں تو یہ سلیم نے آخر اپنے ماموں کا پاس کیا اور اُن کی بیٹی کو بیاہ لایا ہم خوشی کے ساتھ اپنی تباہی گوارا نہیں کر سکتے ہمیں اُس وعدہ شکن، حیلہ ساز اور خود غرض سے انتقام لینا ہے۔ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ فریب کا جواب سازش سے دیا جائے گا —— اس قسم کی باتیں بنا کر وہ دونوں خود ایک دوسرے کو دھوکا دے رہی تھیں اور اپنی سچائی ثابت کر رہی تھیں۔ دونوں کے دل میں چور تھا

ریاضی یا تو بیرسٹر صاحب کے سایہ سے بھاگتی تھی او اب وہ اُنکی طرف خود بڑھی۔ بیرسٹر صاحب کی تو باچھیں کھل گئیں۔ دریا خود پیاسے کی سمت بڑھ رہا تھا۔ اور شکار صیاد کو ملتجی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کہ میں شکار ہونے کے لئے تیار ہوں۔ بیرسٹر صاحب سے ریاضی کو قطعی دلچسپی نہ تھی۔ جذبہ انتقام نے اُس کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔ چند دن کی کورٹ شپ کے بعد بیرسٹر صاحب نے ریاضی کے ساتھ شادی کر لی۔ ریاضی اب اُس گھر کی مختارِ کار بن کر رہنے لگی جس میں اُس کی رقیب نوشابہ موجود تھی۔ سلیم باپ کی شادی کا مخالف نہ تھا مگر ریاضی کے ساتھ شادی کا ہونا اُسے اچھا نہ لگا۔ ریاضی کی زندگی اُس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ اور یہ بات تو اُس کے لئے سوہانِ روح تھی کہ جو عورت خود میرے ساتھ اظہارِ محبت کر چکی ہے آج وہ میری سوتیلی ماں ہے۔ سلیم نوشابہ سے بات کرنے میں آنکھیں نہ ملاتا۔ بیرسٹر صاحب کے برتاؤ میں شادی کے بعد کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوئی تھی اور ریاضی نے ابھی تک پر پرزے نہ نکالے تھے۔ مگر سلیم کا دل آپ ہی آپ خلش سی محسوس کرتا تھا۔ ریاضی نے آکر اُس کا اطمینان چھین لیا۔ وہ

ایسا ہی کر رہے گا۔ ریاضی نے ایک دن سلیم سے باتوں باتوں میں کہا کہ تمہاری والدہ کس صورت شکل کی تھیں؟ سلیم نے اپنی ماں کا حلیہ بتا یا۔ ریاضی خاموش ہو گئی۔ اس پر سلیم نے اصرار کیا کہ تم بات پوچھ کر چپ کیوں ہو گئیں؟ اور تم نے یہ سوال مجھ سے کیوں پوچھا؟ ریاضی نے اس طرح انکار کیا گویا وہ بات ٹالنا چاہتی ہے اور کسی راز کو چھپا رہی ہے۔ سلیم اصرار کرنے لگا تو اس پر ریاضی بولی کہ بیرسٹر صاحب آج تمہاری مرحومہ ماں کے حسن کی تعریفیں کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ وہ نوشابہ سے صورت میں ملتی جلتی تھیں۔ ایسا ناک نقشہ مجھے بہت پسند ہے۔ سلیم نے اس کہنے کا کوئی خاص اثر نہیں لیا۔ مگر جب جمیلہ نے بیرسٹر صاحب کو فریب دیا کہ سلیم کو قدرت سے ایسی خوبصورت بیوی مل گئی ہے اور وہ اس کو خاطر میں نہیں لاتا۔ شادی کے بعد کئی لڑکیوں سے اظہار محبت کر چکا ہے۔ اس پر بیرسٹر صاحب نے ایک دن "حدیثِ دیگراں" کے انداز میں سلیم پر ڈھال کر یہ کہا کہ خوبصورت بیویاں قسمت ہی سے ملتی ہیں اس نعمت کی قدر کرنی چاہیئے۔ اب سلیم کا ذرا ماتھا ٹھنکا کہ آخر والدِ بزرگوار میری بیوی کے حسن کی تعریفیں کیوں فرما رہے ہیں۔

ریاضی نے ایک دن اصرار کر کے نوشابہ کو بیرسٹر صاحب کے ساتھ سینما دیکھنے کے لئے بھجوا دیا۔ اور سلیم کے آنے پر بات بنا کر بولی کہ نوشابہ نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا کہ پھوپا جان (بیرسٹر صاحب) کے ساتھ سینما جائینگی میں نے اُن سے کہا کہ نوشابہ تمہارے ساتھ سینما جانا چاہتی ہے اس بیچاری کا دل تھوڑا نہ کرو۔ اسے لے جاؤ۔ غرض جمیلہ اور ریاضی نے سلیم کو باپ کی

طرف سے بدگمان کر دیا۔ سلیم کو یقین سا ہو چلا تھا کہ بیرسٹر صاحب کو میری بیوی سے دلچسپی ضرور ہے۔ سلیم اپنا یہ غم کس پر ظاہر کرتا کہ میرے باپ میری بیوی کو چاہتے ہیں اور باپ کو ٹوکنا تو اس سے زیادہ اُس کے لئے مشکل تھا۔ وہ باپ سے آخر کس طرح اور کن لفظوں میں کہتا کہ آپ میری بیوی کو پسندیدگی اور شفقت کی نگاہ سے نہ دیکھا کیجئے۔ بیوی سے اگر وہ کہتا کہ اپنے خسر کے سامنے آنے جانے میں احتیاط مدِّ نظر رکھو تو اور سُبکی اور ذلّت کی بات تھی۔ اُس کے ذہن میں اب یہ خیال بھی آنے لگا کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے کیا عجب ہے کہ نوشابہ نے بھی خسر کے اظہارِ پسندیدگی کو گوارا کر لیا ہو۔

سازش کا پہلا مرحلہ تھا ——— بیٹے کے دل میں باپ کی طرف سے بدگمانی۔ سو یہ مرحلہ بہت حُسن و خوبی کے ساتھ طے ہو گیا اور اب سازش نے تیزی کے ساتھ قدم بڑھانا شروع کر دئے۔ یہاں تک کہ سازش کی منزلِ مقصود آ گئی۔

سلیم ایک دن شب میں سینما دیکھنے گیا۔ سیکنڈ شو سے وہ عموماً ایک بجے کے قریب واپس ہوتا تھا۔ رات کو جب سب سو گئے تو رباعنی نوشابہ کے کمرے میں آ کر بولی کہ بیرسٹر صاحب کی طبیعت آج ٹھیک نہیں ہے، چکّر آ رہے ہیں اور دل گھبرا رہا ہے۔ ڈاکٹر کی دوا سے اُنہیں سکون تو ہو گیا ہے مگر ایک بجے کے قریب ایک خوراک دوا اُن کو اور دینی چاہئے۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ کیا خبر ایک بجے آنکھ کھُلے یا نہ کھُلے۔ تم ٹھیک ایک بجے بیرسٹر صاحب کو جگا کر دوا پلا دینا! دیکھو! غفلت نہ کرنا۔ نوشابہ نے

جواب دیا کہ آپ بے فکر رہیے۔ پھوپا جان کو ایک بجے دوا ضرور پلا دی جائیگی۔ وکیل صاحب کے سینما سے واپس آنے تک تو میں یوں بھی جاگتی رہونگی۔ بیرسٹر صاحب کی نوکرانی علیمن نے یہ تمام گفتگو اپنے کانوں سے سُنی تھی۔ ریاضی کے طور طریق سے وہ بھی خوش نہ تھی۔

ایک بجے سے چند منٹ پہلے نوشابہ پلنگ سے اُٹھی اور دوا کی شیشی لے کر بیرسٹر صاحب کے کمرے کی طرف روانہ ہو گئی۔ ریاضی صدر دروازے کے قریب برآمدے میں ٹہلنے لگی۔ سلیم نے دروازے پر دستک دی۔ نوکرانی نے دروازہ کھولا۔ ریاضی کو بے تابی کے ساتھ برآمدے میں ٹہلتا دیکھ کر سلیم نے پوچھا کہ کیوں خیر تو ہے؟ یہ آپ بے چینی کے ساتھ ٹہل کیوں رہی ہیں؟ ریاضی نے گردن جُھکالی جیسے وہ راز کی بات کسی اندیشہ کے سبب کہنا نہیں چاہتی اور وہ کسی وجہ سے بہت زیادہ ملول اور متاثر ہے۔ سلیم نے اصرار کر کے پوچھا تو ریاضی سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی :۔

" کیا کہوں بیٹے! نوشابہ بیرسٹر صاحب کے کمرے میں ہے۔"

سلیم کے تن بدن میں آگ لگ گئی وہ دیوانہ وار صحن میں پہنچا تو نوشابہ واقعی بیرسٹر صاحب کے کمرے سے نکل رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے شُعلے نکلنے لگے۔ وہ زخمی شیر کی طرح بپھر گیا اور دیوانوں کی مانند اپنے کمرے میں پہنچا۔ بندوق اُٹھائی۔ کارتوس ڈالا اور بھری بندوق لے کر صحن میں آگیا۔ نوشابہ صحن کے آخری حصہ میں تھی کہ اُس نے یہ کہتے ہوئے :۔

"نوشابہ! تیری بے وفائی کا صلہ بندوق کی گولی ہی ہوسکتی ہے"

نوشابہ کی طرف بندوق کی نال سیدھی کردی۔ علیمن تخت پر لیٹی تھی اور سب کچھ دیکھ اور سُن رہی تھی۔ اُس نے جلدی سے آکر سلیم کا ہاتھ تھام لیا۔ سلیم نے زور سے جھٹکا دیا۔ علیمن فرش پہ گر پڑی اور ہاتھ کے جھٹکے نے بندوق کا رُخ دوسری طرف کر دیا۔ بندوق دَن سے چلی اور گولی ریاضی کے سینہ کے پار ہوگئی۔ ایک شور مچ گیا کہ بیرسٹر صاحب کے یہاں خون ہوگیا۔ بیرسٹر صاحب لاکھ با اثر تھے مگر قتل وخون کی واردات جس کی شہرت ہوچکی ہو، چُپ چاپ دب نہیں سکتی۔

بیرسٹر صاحب کی ملازمہ علیمن جو آج تک چُپ چُپ رہتی تھی اور خاموشی کے ساتھ اس ڈرامہ کو دیکھ رہی تھی، اب خاموش نہ رہ سکی۔ اُس نے سلیم کو تمام واقعات بتا دیئے۔ سلیم پر نوشابہ کی بے گناہی اور ریاضی کی خوف ناک سازش ظاہر ہوگئی۔ سلیم اپنی معصوم بیوی کو دیکھ کر دل ہی دل میں کہتا:۔

؎ تو اگر گشتہ شدی آہ چہ می کردم من

سلیم بہت خوش تھا کہ اُس کی بندوق نے حق ادا کر دیا۔ عدالت میں سلیم کا چالان ہوا اور مقدمہ سشن سپرد ہوگیا۔ سشن نے اُس کو سات سال قید بامشقت کی سزا سُنائی۔ شہر میں ہر طرف اسی مقدمہ کا چرچا تھا۔ دوست ملول تھے اور دشمن شادماں!

نوشابہ نے جب سزا کا حال سُنا تو اُس نے کلیجہ تھام لیا۔ اُس کے

دل کو زبردست دھکا لگا۔ وہ دل ہی دل میں کہنے لگی :-

"کاش! ریاضی کی جگہ میرے گولی لگتی اور مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا"

بیرسٹر صاحب نے اکلوتے اور شریف و خوددار بیٹے کے لئے زمین آسمان ایک کر دیئے۔ کنکری کی طرح روپیہ خرچ کیا اور پانی کی مانند دولت بہائی۔ دوسرے وکیلوں نے بھی بہت کچھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ ہائی کورٹ میں مرافعہ (اپیل) دائر ہوا اور عدالت عالیہ نے سزائے قید کو ایک ہزار روپیہ کے جرمانہ سے بدل دیا۔ سلیم کے گھر میں عید ہو گئی۔

سلیم جب عدالت سے گھر واپس آیا تو نوشابہ پھولوں کا ہار لے کر دوڑی۔ سلیم نے ہنس کر کہا :-

"نوشابہ! پھولوں کا ہار مجھے نہیں، میری وفادار بندوق کو پہناؤ!"

نوشابہ نے پھولوں کا ہار بندوق پہ مسکرا کر لپیٹ دیا ۔